اِنْ اُرِیْدُ اِلَّا الْاِصْلَاحَ مَا اسْتَطَعْتُ

ماہنامہ

البرہان

لاہور

مئی ۲۰۱۹ء

مدیر ڈاکٹر محمد امین

CPL No. 296 May 2019

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

تدریس القرآن ① برائے معلمین	۱۹۰ صفحات
تدریس القرآن ① برائے طلبہ وطالبات	۷۲
تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت ۔ ہینڈ بک وگائیڈ	۱۶۰
ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
نصابِ مدنیؒ	۴۰
اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
مسلم نشاۃ ثانیہ ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۷۰

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور، فون نمبر: 0321-8836932
مکتبہ البرہان، A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور، 0309-4607124

بلامعاوضہ

سکولوں، کالجوں، یونیورسٹیوں اور قرآنی حلقوں میں
قرآن حکیم کا ترجمہ سکھانے کی منفرد کتاب

تدریس القرآن ①

❋ صرف ایک پارہ پڑھنے سے سارے قرآن کا ترجمہ
کرنے کی صلاحیت پیدا ہو جاتی ہے۔
❋ پانچویں سے اوپر کی جماعتوں کے لیے موزوں
❋ جدید اور سائنٹفک انداز۔ عربی گرامر کی الجھنوں
اور رٹے سے دور
❋ اساتذہ اور طلبہ (و طالبات) کے لیے الگ کتابیں
❋ اساتذہ کے لیے فری ٹریننگ

تدریس القرآن فاؤنڈیشن

A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،

فون: 0333-4287640، 0300-4354673

ڈاکٹر محمد امین کی چند اہم تصانیف

❁ تدریس القرآن (۱) برائے معلمین	۱۹۰ صفحات
❁ تدریس القرآن (۱) برائے طلبہ وطالبات	۷۲
❁ تعلیمی اداروں میں تعمیر سیرت۔ ہینڈ بک و گائیڈ	۱۶۰
❁ ہمارا تعلیمی بحران اور اس کا حل	۴۵۰
❁ ہمارا دینی نظام تعلیم	۲۵۰
❁ تعلیمی ادارے اور کردار سازی	۱۷۰
❁ اسلامی سکول کے خدوخال	۸۰
❁ نصابِ مدنیؒ	۴۰
❁ اسلام اور تزکیۂ نفس (مغربی فکر کے ساتھ تقابلی مطالعہ)	۹۰۳
❁ حقیقتِ تزکیۂ نفس (سوالاً جواباً)	۶۰
❁ ترکِ رذائل (احمد جاوید)	۲۵۰
❁ مسلم نشاۃ ثانیہ۔ اساس اور لائحہ عمل	۳۰۰
❁ اسلام اور تہذیبِ مغرب کی کشمکش	۱۷۵
❁ اسلامی اور مغربی اصطلاحات کا تقابلی مطالعہ	۱۷۵
❁ عصرِ حاضر میں دین کا متوازن تصور	۷۰

ڈسکاؤنٹ سمیت
بدون ڈاک خرچ

کتاب محل دربار مارکیٹ لاہور، فون نمبر: 0321-8836932
مکتبہ البرہان، A-97 نیلم بلاک، علامہ اقبال ٹاؤن، لاہور،
فون نمبر: 0309-4607124

ماہنامہ **البرہان** لاہور

جلد ۲۳، شمارہ ۵، مئی ۲۰۱۹ء/شعبان ۱۴۴۰ھ

مشمولات

○فکر و نظر

ہاں! مَیں باغی ہوں ۴

○تعلیم و تربیت

مدیر

۔رمضان ۔ ماہِ تربیت ۶

۔فلسفۂ تعلیم سے متعلق چند مباحث سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ ۷

۔پاکستانی نظامِ تعلیم کے تین ناسور ڈاکٹر محمد امین ۱۷

۔ عصرِ حاضر میں اعلیٰ تعلیم پروفیسر ملک محمد حسین ۱۹

۔ چیف جسٹس آف پاکستان کی خدمت میں ڈاکٹر محمد اکرم چودھری ۲۷

۔تعلیمی ثنویت کا ذمہ دار کون؟ مولانا زاہد الراشدی/ مدیر ۳۱

○فہم اسلام

۔ مسلم معاشرے میں تبدیلی کیسے آسکتی ہے؟ شیخ ناصر الدین الالبانیؒ ۳۹

۔اسلام میں انتہا پسندی کا مفہوم مدیر ۴۱

○تفہیم مغرب

نظامِ سرمایہ داری اور عقیدۂ آزادی ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری ۴۲

○پاکستانیات

۔پاکستان میں چینی باشندوں کی شادیاں عاصم حفیظ ۴۵

۔عصرِ حاضر میں تبدیلی کا ذریعہ بیلٹ بکس لیکن پروفیسر ملک محمد حسین ۴۸

۔ چین ۔ نیا استعمار؟ ڈاکٹر محمد امین ۴۹

○عالم اسلام

ہم نے بیت المقدس کیسے کھویا؟ شیخ اسعد التمیمی ۵۱

○تبصرے

مختصر تبصرے مدیر ۵۵

فکر و نظر

ہاں! مَیں باغی ہوں

ہاں! مَیں باغی ہوں

- مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کا

کیونکہ اسلام اپنی ایک تہذیب رکھتا ہے جو اس سے مختلف ومتضاد ہے اور اس سے اعلیٰ وبرتر بھی۔

- مغرب کے نیشنلزم اور اس کی نیشن سٹیٹ (قومی ریاست) کا

کیونکہ سارے مسلمان ایک 'امت' ہیں اور اسلام ایک نظریاتی ریاست کا علمبردار ہے۔

- مغرب کی ملحدانہ وسرمایہ دارانہ جمہوریت کا

کیونکہ اسلام حاکمیت الٰہ، شورائیت اور خلافت پر مبنی اپنا ایک سیاسی نظام رکھتا ہے۔

ہاں! مَیں باغی ہوں

- مغرب کے مادہ پرست اور سود پر مبنی سرمایہ دارانہ نظام کا

کیونکہ اسلام ہمیں فلاحی معیشت کا ایک پورا نظام دیتا ہے۔

- مغرب کی فحاشی، عریانی اور زناکاری کا

کیونکہ اسلام ہمیں حیا وعفت پر مبنی ایک معاشرتی نظام دیتا ہے۔

ہاں! مَیں باغی ہوں مغرب کی ملحدانہ فکر وتہذیب کا

اس لیے کہ بالادست مغرب نے اپنی یہ تہذیب ہم پر مسلط کر رکھی ہے

اور ہمارے کوتاہ نظر حکمران اسے ہم پر ٹھونسے ہوئے ہیں

اور ہمارے کوتاہ نظر دانشور، ادیب، صحافی اور علماء اس کی تائید کرتے ہیں

حالانکہ حد اس کے کمالات کی ہے برق وبخارات

اور اس لیے کہ اس کے اندھیروں میں انسانیت آج بھی سسکتی ہے

اور غربت وافلاس اسی کی دین ہیں

ہاں! تم کہہ سکتے ہو کہ مغرب کی یہ بالا دست تہذیب روحِ عصر ہے
اور اس روحِ عصر کی مزاحمت جرأت نہیں حماقت ہے
اس کا فائدہ ہی آخر کیا ہے؟

نہیں! مَیں اس طاغوت، اس ملحدانہ اور مردہ تہذیب کی مزاحمت کرتا رہوں گا
آج اگر مَیں اس تہذیب کو چیلنج نہیں کروں گا اور زوال کے اندھیروں سے نکلنے کے خواب نہیں دیکھوں گا
تو کل اس خواب میں رنگ کیسے بھروں گا؟

اٹھو! میری امت کے بوڑھو اور جوانو! اٹھو
قرآن وسنت کا عَلم اور عِلم لے کر اٹھو اور دنیا پر چھا جاؤ
لیکن.... اس کے لیے ضروری ہے کہ
تم پہلے اپنے چھ فٹ کے قد پر اسلام نافذ کرو
نورِ وحی کی حکمتوں سے اپنا سینہ بھر لو اور حکمتوں کے اس نور سے مغرب کے اندھیروں میں اُجالے بھر دو

رات کو مصلے پر اور دن میں گھوڑے کی پیٹھ پر
یہی ہمارے اسلاف کا طریقہ رہا ہے

سنو! مجھے رات کے اندھیروں سے نہ ڈراؤ
مَیں امید کا چراغ ہوں
مجھے روشن رہنے دو

ہاں! مَیں اس تہذیب کا باغی ہوں
مَیں اس سے بغاوت کرتا رہوں گا
مَیں اس کی مزاحمت کرتا رہوں گا

افسوس! کر سکتے تھے جو اپنے زمانے کی امامت
وہ کہنہ دماغ اپنے زمانے کے ہیں پیرو

تزکیۂ نفس

رمضان۔ ماہِ تربیت

رمضان تربیت کا مہینہ ہے۔ تربیت کس چیز کی؟ بندے کو ربّ سے جوڑنے کی، اللہ سے قرب کا موقع پانے کی، اللہ سے ڈرنے کی۔ اللہ نے ہمیں عبدیت اور بندگی کے لیے پیدا کیا ہے ﴿وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنَ﴾۔ میرا، آپ کا، ہر مسلمان کا، ایک ہی ہدف ہونا چاہیے اور وہ یہ کہ ہم اللہ کے سچے عبد بن جائیں، اللہ ہم سے راضی ہو جائے۔

عبدیت اور بندگی کے دو بڑے مظہر ہیں: ایک اس کی پرستش اور دوسرے اس کی اطاعت، اطاعت اس وقت تک نہیں ہو سکتی جب تک اس کی پرستش اور بندگی کا غلبہ ہمارے دل و دماغ پر حاوی نہ ہو جائے اس لیے پرستش اہم تر اور بنیادی چیز ہے۔ لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اطاعت غیر اہم ہے۔ اطاعت بھی اہم ہے۔ یہ رائے افراط و تفریط پر مبنی ہے کہ بندگی بایں معنی کی جائے کہ اطاعت اس کا جز و نہ ہو۔ اور اطاعت کرنا لیکن عبادت و بندگی سے غفلت برتنا یہ بھی غلط اور نا قابل قبول ہے۔ متوازن رویہ یہ ہے کہ عبدیت اور بندگی ان دونوں معنوں میں بیک وقت کی جائے۔

روزہ کیا ہے؟ اللہ نے جن چیزوں کو ہمارے لیے حلال کیا ہے انہیں بھی اس کے کہنے پر ایک مخصوص مدت کے لیے اپنے اوپر حرام کر لینا اور یہ کام بار بار کرنا۔ ایک دن، دو چار دن نہیں پورا مہینا کرنا۔ اور اس کے لیے توانائی کہاں سے آئے گی۔ تلاوتِ قرآن سے، تراویح کی زائد نفل عبادت سے۔ تہجد میں جاگنے سے۔ راتوں کو کھڑے ہو کر قرآن سننے سے۔

رمضان کا تقاضا یہ ہے کہ ان دیکھے خدا سے ڈرنا ایک تصور سے بڑھ کر عمل کی شکل اختیار کر لے۔ آپ بھوکے پیاسے بیٹھے ہیں اور گھر میں فرج میں ٹھنڈا پانی اور دوسری نعمتیں موجود ہیں لیکن آپ پانی نہیں پیتے، کھانا نہیں کھاتے۔ کیوں؟ اس لیے کہ کوئی اور نہیں دیکھ رہا، اللہ تو دیکھ رہا ہے۔ یہ ہے ان دیکھے خدا سے ڈرنے کی رمضان بھر کی پریکٹس۔

رمضان شہرِ مواساۃ ہے، غریبوں کا دکھ درد بانٹنے کا مہینہ ہے۔ یہ شہرِ نظم و ضبط ہے، نفس کو اللہ کی اطاعت کا خوگر بناتا ہے۔ اے اللہ! ہمیں رمضان سے موثر استفادے کی توفیق عطا فرما!

تعلیم و تربیت　　　　مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ

فلسفۂ تعلیم سے متعلق چند مباحث

سید مودودیؒ کی عصری مجالس کی ایک جھلک - مرتبہ پروفیسر حفیظ الرحمن احسن

ایک نوجوان جو مولانا سے کچھ فاصلے پر خاموشی سے بیٹھا تھا، سوال کا موقع پا کر مولانا سے مخاطب ہوا:

''مولانا میں یہاں پی ایچ ڈی ایجوکیشن کا طالب علم ہوں۔ ہماری جماعت میں آج کل برٹرینڈ رسل کی کتاب Education and Social Reconstruction کا ایک اقتباس زیر بحث ہے۔ اس سلسلے میں آپ کی رہنمائی حاصل کرنے کے لیے حاضر ہوا ہوں۔ میرے دوسرے ساتھی بھی آپ کی رائے جاننے کے خواہش مند ہیں۔''

کہیے کیا اقتباس زیر بحث ہے؟ مولانا نے دریافت فرمایا:

نوجوان گویا ہوا: اس اقتباس کا مفہوم یہ ہے کہ جوں جوں تہذیب ترقی کرتی ہے مذہبیت زوال پذیر ہوتی جاتی ہے اور اسی طرح اس کے برعکس جن معاشروں میں مذہب کی گرفت مضبوط ہوتی ہے۔ ان کی ترقی کی رفتار سُست ہوتی ہے۔ یہ بات کہاں تک درست ہے؟

مولانا نے فرمایا: ''اس سلسلے میں پہلی بات تو آپ یہ سمجھ لیجیے کہ یہ لوگ جب مذہب کا ذکر کرتے ہیں تو اس سے ان کی مراد عیسائیت ہوتی ہے۔ مذہب کے بارے میں اُن کا کوئی تصور عیسائیت سے ہٹ کر نہیں ہوتا۔ دوسری بات سمجھنے کی یہ ہے کہ یہ لوگ جس تہذیب کے قائل ہیں وہ سب سے پہلے تو یونانی تہذیب ہے پھر رُومی تہذیب ہے۔ اس کے بعد ان کے نزدیک موجودہ مادہ پرستانہ مغربی تہذیب ہے جو دراصل پہلی دونوں تہذیبوں کی وارث ہے۔ درمیانی سارے عرصے کو وہ قرونِ مظلمہ سے تعبیر کرتے ہیں۔ اب آپ دیکھیے کہ جب رسل اور دوسرے مغربی مفکرین یہ کہتے ہیں کہ مذہب ترقی کی راہ میں رکاوٹ کا باعث بنتا ہے تو یہ ایک واضح بات ہے کہ مذہب سے مراد ان کی عیسائیت ہے اور تہذیب سے مراد موجودہ مادہ پرستانہ تہذیب۔ جب یورپ میں سپین اور سسلی کے مسلمانوں کی آمد کے ساتھ جہالت کی تاریکیاں

چھٹنے لگیں اور روشن خیالی اور فکری آزادی کا دور شروع ہوا تو برطانیہ میں کلیسا کی ناروا پابندیوں کے خلاف تحریکِ اصلاحِ کلیسا اٹھی۔ عیسائیت کے پاس زندگی کے جملہ معاملات کے لیے کوئی ضابطۂ ہدایت موجود نہ تھا۔ صرف پاپائے روم کی زبان وقول خدا کی مرضی کے ترجمان اور قانون بنانے والے تھے۔ اس کا زمین پر باندھا ہوا آسمان پر بندھتا تھا۔ لیکن ظاہر ہے کہ پوپ کا یہ مقام اور غیر معمولی اقتدار جدید عقلیت پرستوں کے لیے قابل قبول نہیں ہوسکتا تھا۔ یورپ میں صنعتی انقلاب رونما ہوا تو اس سے بے شمار تہذیبی اور معاشرتی مسائل پیدا ہوئے جن کا کوئی حل عیسائیت کے پاس نہیں تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ پہلے عیسائیت کے خلاف بغاوت ہوئی اور پھر حق کا معیار خدائی ہدایت نہیں بلکہ عقل وتجربے سے حاصل کردہ علم قرار پایا۔ اس سارے پس منظر کو سامنے رکھ کر آپ دیکھیں کہ رسل صاحب نے تہذیب اور مذہب کے درمیان جو تعلق قائم کیا ہے اُن کی بنیاد خود ان کی اپنی تہذیب اور ان کا اپنا مذہب ہے نہ کہ اسلام یا اسلامی تہذیب۔ ان کے اس قول کو یہاں ان معنوں میں سرے سے زیر بحث لانا ہی غلط اور بے محل ہے کیونکہ نہ وہ اسلام کو جانتے ہیں اور نہ اسلامی تہذیب کو۔

اس وضاحت کے بعد مولانا نے گفتگو کو جاری رکھتے ہوئے فرمایا: موجودہ دور میں مغرب نے یا اس کے زیر اثر دوسرے ممالک نے سائنس، طب اور دوسرے میدانوں میں جو ترقی کی ہے وہ اس وجہ سے نہیں کی ہے کہ انہوں نے مذہب کو چھوڑ دیا بلکہ اس وجہ سے کی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے انسان کو تحقیق واکتساب کی جو صلاحیتیں اور قوتیں بخشی ہیں ان کو انہوں نے استعمال کیا۔ اب اگر انسان ان مادی قوتوں کی تسخیر کے ساتھ ساتھ خدائی ہدایت کی پابندی بھی کرے تو وہ ترقی کے جس اوج کمال پر پہنچ سکتا ہے اس کا کوئی اندازہ ہی نہیں ہوسکتا۔

کچھ توقف کے بعد فرمایا: یہ بات میں آپ کو ایک مثال سے سمجھاتا ہوں۔ ایک شخص جو اپنی ذاتی زندگی میں بہت ایماندار اور دیانت دار ہے اور پورے احساسِ ذمہ داری کے ساتھ اخلاقی اصولوں کی پابندی کرتا ہے وہ اگر منڈی میں آکر بیٹھے اور وہاں تجارت کرتے وقت اسی دیانت اور احساسِ ذمہ دری کے ساتھ کام کرے تو اس شخص کی جو ساکھ بازار میں قائم ہوگی کیا کسی دوسرے شخص کی وہ ساکھ ہوسکتی ہے؟ اسی سے آپ اندازہ کریں کہ اگر کسی معاشرے میں مذہب اپنی حقیقی شان کے ساتھ موجود ہو تو وہ ترقی کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنتا بلکہ ایسا معاشرہ

ہی حقیقی اور پائیدار ترقی کی بلند ترین منازل طے کرسکتا ہے۔ ترقی کی راہ میں رکاوٹ ہونے والی چیز مذہب نہیں ہے بلکہ منافقت ہے یعنی یہ کہ آپ کا عقیدہ کچھ اور ہو اور عمل کچھ اور ہو۔ عقیدہ وعمل کا یہ تضاد فرد کے داخل میں بھی ایک انتشار اور کشمکش کو جنم دیتا ہے اور یہی کشمکش پھر اجتماعی سطح پر فرد اور معاشرے کے ٹکراؤ کی صورت میں سامنے آتی ہے۔ آج اکثر مسلم ممالک کا المیہ یہی ہے کہ ان میں مذہب کا نام تو لیا جاتا ہے لیکن عمل اس کے خلاف ہو رہا ہے۔ نتیجہ دنیا اور آخرت دونوں میں خسارے کی صورت میں سامنے آرہا ہے۔ ان ممالک میں قیادتوں کا حال یہ ہے کہ قوم کے اجتماعی ضمیر کا فیصلہ کچھ اور ہے لیکن یہ قیادتیں قوم کو ہانک کر کسی اور طرف لے جانا چاہتی ہیں۔

مولانا نے اس ضمن میں ترکی کی قریبی تاریخ کا حوالہ دیتے ہوئے فرمایا: مصطفےٰ کمال صاحب نے اپنے زمانۂ اقتدار میں ترکی میں نو مرتبہ مارشل لاء نافذ کیا۔ انہوں نے چاہا کہ ترکی قوم فلاں تاریخ سے لازماً ہیٹ پہنے، فوراً مارشل لاء لگا دیا گیا۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ بیک وقت ڈیڑھ دو کروڑ افراد کے لیے اتنی تعداد میں ہیٹ کیسے مہیا کیے جائیں چنانچہ ہوا یہ کہ سارے یورپ سے جو کنڈم مال جہاں جہاں دبا پڑا تھا سب نکل آیا اور خود حکومت نے اسے منگوانے کا انتظام کیا۔ پھر مصطفےٰ کمال صاحب نے سوچا کہ پردہ رجعت پسندی کی علامت ہے۔ حکم دے دیا گیا کہ فلاں تاریخ سے کوئی عورت بُرقع پہن کر باہر نہ نکلے اور عملاً یہ ہوا کہ عورتوں کے برقعے نوچ نوچ کر اتروائے گئے۔ انہی صاحب نے ترکی کا عربی رسم الخط ختم کر کے قوم پر رومن رسم الخط مسلط کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ قوم اپنے پورے علمی اور تہذیبی ورثے سے کٹ گئی۔ حکم دیا گیا کہ آئندہ سے اذان عربی میں نہیں بلکہ ترکی زبان میں ہوگی اور عملاً پچیس سال تک ترکی عربی اذان سے محروم رہا۔ یہ اور اس طرح کے دوسرے بے شمار کارنامے ہیں جو انہوں نے ترقی کے نام پر سرانجام دیے اور اس غرض سے بار بار مارشل لاء لگایا۔ آج تک ترکی اس شدید صدمے سے سنبھل نہیں سکا۔

کچھ توقف کے بعد پھر فرمایا: اس سے آپ خود فیصلہ کرسکتے ہیں کہ مسلم ممالک میں ترقی کی راہ کا اصل روڑا دین سے دوری اور منافقت ہے یا کہ دین خود۔ مَیں پہلے آپ کو یہ بات سمجھا چکا ہوں کہ اگر ترقی دین و مذہب اور اخلاق کو ساتھ لے کر کی جائے تو اس کے منتہائے

کمال کی کوئی حد نہیں ہے۔

ایک صاحب نے سوال کیا: مولانا آپ نے فرمایا کہ رَسل اور اس قسم کے دوسرے مغربی مفکرین جب مذہب کا ذکر کرتے ہیں تو ان کی مراد عیسائیت ہوتی ہے حالانکہ یہ لوگ دوسرے ادیانِ عالم کا مطالعہ بھی کرتے ہوں گے اور اسلام سے بھی ناواقف نہ ہوں گے۔

مولانا نے فرمایا: مَیں یہ بات پورے دعوے کے ساتھ کہتا ہوں کہ یورپ کے ان سکالرز اور مستشرقین میں علمی دیانت بالکل نہیں ہے۔ یہ لوگ اسلام اور اسلامی تہذیب کے بارے میں سخت متعصب ہیں۔ مثال کے طور پر ان کے تعصب کا اندازہ آپ اس بات سے کر سکتے ہیں کہ یورپ میں جس قدر علمی بیداری پیدا ہوئی اس کا اصل سہرا ان مسلمانوں کے سر ہے جو سپین اور سسلی سے بھاگ کر یورپ میں پناہ گزیں ہوئے تھے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے لیکن یورپین سکالرز صدیوں تک اس حقیقت کو چھپاتے رہے۔ اب کہیں آ کر مغربی مفکرین اس کا اقرار کرنے لگے ہیں۔

مسلم سپین کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نے فرمایا: سپین میں مسلمانوں کی علمی دھاک اس قدر بیٹھی ہوئی تھی کہ وہاں کے عیسائی پادری آپس میں خط وکتابت تک عربی زبان میں کرتے تھے۔ اس پر سپین کی عیسائی اقلیت احتجاج بھی کرتی تھی لیکن اس زمانے میں علمی زبان کا عربی کے سوا کوئی تصور ہی نہ تھا۔

ایک نوجوان نے سوال کیا: فلسفۂ تعلیم کا ایک طالب علم ہونے کی حیثیت سے مَیں یہ جاننا چاہتا ہوں کہ مذہب میں زبان کا رول کیا ہے اور بالخصوص اس کی وجہ کیا ہے کہ اسلام کی دینی زبان دنیا بھر کے ممالک کے لیے ایک ہی رکھی گئی ہے اور اس طرح تمام مسلمانوں کو اس کے پڑھنے اور سمجھنے پر مجبور کیا گیا ہے۔

مولانا نے فرمایا: آپ خود غور کریں کہ اگر دین کی کوئی ایک ہی زبان نہ ہو اور ہر قوم اور ملک کے لیے اس کی اپنی زبان دینی زبان قرار دی جائے تو زبان کی طرح دین بھی آہستہ آہستہ مقامی اور قومی (Nationalised) ہو جائے گا۔ مثلاً چرچ آف انگلینڈ کے نام ہی سے اس کے ایک خاص قوم اور ملک کے لیے مخصوص ہونے کا احساس پیدا ہوتا ہے۔ ایسا ہی امریکن چرچ کا معاملہ ہے حالانکہ یہ دونوں عیسائی کلیسا ہیں۔ یہی صورت زبانوں کے اختلاف

سے پیدا ہوتی ہے۔ مثلاً ایک جرمن اپنی زبان میں خدا کو یاد کرتا ہے تو ایک انگریز کو پتہ بھی نہیں چل سکتا کہ یہ اُسی خدا کو یاد کر رہا ہے جس پر مَیں ایمان رکھتا ہوں۔ اس لیے یہ بات ناگزیر ہے کہ ایک عالمگیر وحدت بنانی مقصود ہو تو اس کے لیے دینی زبان بھی کسی ایک زبان کو قرار دیا جائے۔ اسلام نے عربی زبان کو یہی حیثیت دی ہے۔ یہ زبان کے اشتراک ہی کا فیض ہے کہ اگر کسی جگہ میدانِ جنگ سے اللہ اکبر کا نعرہ بلند ہوتا ہے تو ایک مسلمان فوراً یہ جان لیتا ہے کہ ایک گروہ خدا کے دین کے لیے لڑ رہا ہے۔ اسی طرح کسی جگہ عربی اذان کی آواز بلند ہوتے ہی ایک مسلمان کو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہاں امت مسلمہ سے تعلق رکھنے والے افراد موجود ہیں وہ مسجد میں جائے گا تو اسی زبان میں نماز پڑھے گا جو نماز کے لیے مقرر کر دی گئی ہے۔ اسی طرح کسی دوسرے ملک یا دوسری قوم میں ہونے کے باوجود وہ کوئی اجنبیت محسوس نہیں کرے گا۔ پھر یہ بات بھی نگاہ میں رہے کہ دنیا میں بے شمار زبانوں کا وجود ہوتے ہوئے یہ ایک غیر فطری بات تھی کہ قرآن کسی سپرانٹو زبان میں اُترتا کیونکہ اختلافِ السنہ خود اللہ تعالیٰ کی حکمت کا ایک نشان ہے البتہ اس اختلاف کے ہوتے ہوئے بے شمار زبانیں بولنے والوں کو ایک ہی امت بنانے کی غرض سے ان کے لیے ایک ہی دینی زبان کو لازم کیا جا سکتا ہے اور یہی صورت اختیار کی گئی ہے۔ اسی بنا پر ہم یہ کہتے ہیں کہ عربی زبان ہر مسلمان قوم کے نظام تعلیم کا لازمی جز ہونی چاہیے۔ دوسری جو زبانیں وہ چاہیں پڑھائیں لیکن قرآن و حدیث کی زبان ہونے کی حیثیت سے عربی زبان کا یہ مقام ہے کہ اس کی تعلیم و تدریس کو اوّلین اہمیت دی جائے۔

اس موقع پر انہی صاحب نے یہ سوال اٹھایا: مولانا! مشکل یہ ہے کہ ہمیں پہلے ہی مختلف زبانوں کے بوجھ تلے دبے ہوئے نظام تعلیم یعنی Languages Ridden Educational System سے سابقہ درپیش ہے، اس پر عربی زبان کی لازمی تدریس کا اضافہ بچوں کے لیے اور پریشان کن ہوگا۔ اس مشکل کا کیا علاج ہے؟

مولانا نے فرمایا: اس مشکل کا حل کچھ نہیں ہے مثال کے طور پر مغربی پاکستان کو لیجیے۔ یہاں اس بات کی ضرورت ہے کہ مقامی زبانوں کی مقامی حیثیت کو تسلیم کرتے ہوئے نیچے سے اوپر تک اُردو کو ذریعہ تعلیم بنایا جائے۔ اس کے بعد پھر عربی کے سوا اور کوئی زبان نہیں سیکھنی پڑے گی ہمارے ہاں اصل مسئلہ انگریزی زبان پر بے جا اصرار کی وجہ سے پیدا ہوتا ہے۔

حالانکہ اُردو کو تمام مدارج میں ذریعۂ تعلیم تسلیم کر لینے سے مختلف زبانوں کی تعلیم کا ناروا بوجھ ختم ہوجاتا ہے۔اس برصغیر میں جامعہ عثمانیہ (دکن) میں تمام تعلیم اُردو کے ذریعہ دینے کا نہایت کامیاب تجربہ کیا جاچکا ہے اور وہاں کے فارغ التحصیل طلبہ کسی میدان میں بھی انگریزی تعلیم یافتہ گریجوایٹس سے کم تر ثابت نہیں ہوئے بلکہ ان سے بہتر ثابت ہوئے ہیں کیونکہ یہ ایک فطری امر ہے کہ اپنی قومی اور مادری زبان میں ایک طالب علم مختلف علوم میں جو دسترس پیدا کرسکتا ہے وہ کسی غیر ملکی زبان میں تعلیم پا کرنہیں کرسکتا۔اس ضمن میں دوسرے ممالک کی مثالیں بھی پیش کی جاسکتی ہیں، جہاں ان کی مادری زبان ہی کو ذریعہ تعلیم بنایا گیا ہے مثلاً تھائی لینڈ جیسے چھوٹے ملک میں یونیورسٹی کی سطح تک تعلیم تھائی زبان ہی میں دی جاتی ہے اور ان کا معیارِ تعلیم ہر لحاظ سے تسلی بخش اور کامیاب ہے۔

ایک صاحب کا سوال تھا مولانا: اُردو کو اب تک اس کا مناسب مقام نہ ملنے کی کیا وجوہات ہیں؟

مولانا نے فرمایا: اُردو کو اس کا جائز مقام نہ ملنے کی سب سے بڑی وجہ یہاں کی انگریزی نواز بیوروکریسی ہے۔ یہاں حکمرانوں کا اندازِ فکر یہ رہا ہے کہ اس قوم پر حکمرانی کا ٹھاٹھ جمانے کے لیے یہ ضروری ہے کہ عوام سے الگ تھلگ رہا جائے۔ کیوں اگر عوام ہی کی زبان اختیار کر لی تو پھر صاحبی کہاں چلے گی۔اپنے آقائے نامدار انگریز بہادر سے انہوں نے یہی بات سیکھی ہے اور اسی پر وہ آج تک عمل پیرا ہیں۔اُردو کے بارے میں یہ سرکاری پالیسی اس وقت تک نہیں بدل سکتی جب تک کہ موجودہ نظام ہی میں تبدیلی نہ آئے۔ جب کبھی یہاں وہ لوگ برسرِ اقتدار آئیں گے جو خود کو عوام میں سے سمجھیں اور عوام کی خوشنودی ہی کو اپنی قوت واقتدار کا اصل سرچشمہ مانیں تو وہ لازماً عوامی رابطے کے لیے اردو پر ہی انحصار کریں گے اور ان کا ایک ہی حکمنامہ اس امر کے لیے کافی ہوجائے گا کہ کوئی دفتری کاروائی اُردو کے سوا کسی زبان میں انجام نہ پائے۔اس کے بعد کوئی بڑے سے بڑا انگریز نواز بھی اُردو کی مخالفت کی جرأت نہ کر سکے گا۔

کسی شخص نے قرآن کی مارکسی تعبیر پیش کرنے والے ایک مفکر کا ذکر کیا تو مجلس میں بیٹھے ہوئے ایک صاحب نے کہا مولانا! ان حضرات نے اپنے تھوڑے سے علم کے ساتھ فتنہ تو خوب پھیلا دیا ہے۔مولانا نے فرمایا: فتنہ تو تھوڑے سے تھوڑے علم کے ساتھ ہی پھیلایا جاتا ہے۔علم

جتنا کم ہوتا ہے فتنہ اتنا ہی زیادہ ہوتا ہے۔

کیا اسلام اپنے ماننے والوں کو فکری آزادی دیتا ہے؟ یہ سوال پی ایچ ڈی ایجوکیشن کے ایک طالب علم نے کیا۔

مولانا نے فرمایا: بالکل اسلام نہ صرف اپنے ماننے والوں کو فکری آزادی دیتا ہے بلکہ خود اس کی دعوت دیتا ہے۔ قرآن مجید میں بے شمار مقامات پر لوگوں سے غور وفکر کرنے اور تدبر وتفکر کا مطالبہ کیا گیا ہے۔ اَفَلَا یَتَفَکَّرُوْنَ؟ اور اَفَلَا یَتَدَبَّرُوْنَ؟ کے الفاظ اسی حقیقت پر دلالت کرتے ہیں۔ البتہ یہ فکری آزادی بالکل لامحدود نہیں ہے جیسا کہ ہر تہذیب کو اس کے کچھ حدود متعین کرنے پڑتے ہیں اسی طرح اسلام نے بھی اس کے کچھ حدود متعین کیے ہیں کیونکہ کوئی منضبط معاشرہ بھی اپنے بنیادی اصولوں سے انحراف کرنے کی اجازت نہیں دیتا اور ایسی کسی آزادی کو گوارا نہیں کرتا جو تمام حدود سے بے نیاز ہوجائے مثلاً برطانوی معاشرے میں فکری آزادی کے نام پر کسی شخص کو اس بات کی اجازت نہیں دی جاتی کہ وہ ڈارونزم سے ہٹ کر سوچ سکے یا اس کو ہدف تنقید بنائے۔ اسی طرح سوشلسٹ ملکوں میں اس بات کا کوئی امکان نہیں کہ کوئی شخص سوشلسٹ تھیوری سے ہٹ کر سوچے۔ تو اسی طرح اسلام میں فکری آزادی کے لیے بھی بہر حال کوئی حدود ہیں جن سے انحراف یا تجاوز کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔ ان کی مثال اس طرح ہے جیسے کسی خطرناک پہاڑی راستے پر خطرے کے کچھ نشانات لگا دیے جاتے ہیں کہ ناواقف مسافر حادثات اور ہلاکت سے محفوظ ہوجائیں۔

مولانا: کیا اس کا مطلب یہ لیا جائے کہ اسلام کے پیش کردہ بنیادی حقائق یا مابعد الطبیعی امور کو غور وفکر اور بحث کا موضوع نہیں بنایا جاسکتا؟ ایک صاحب نے سوال کیا۔

مولانا نے جواب دیتے ہوئے فرمایا: دراصل اسلام ان حقائق پر ایک مختلف زاویے سے غور فکر کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام یہ کہتا ہے کہ کچھ حقیقتیں ایسی ہیں جو انسان کے علم میں براہِ راست نہیں آسکتیں، ان کے لیے انسان کسی دوسرے ذریعۂ تعلیم کا محتاج ہے۔ البتہ کائناتِ فطرت میں ان حقیقتوں پر بے شمار شواہد موجود ہیں جو ان کے حقیقت ہونے پر دلالت کرتے ہیں۔ اسلام ان شواہد کو دیکھنے اور پرکھنے اور ان کے ذریعے سے ان حقائق تک پہنچنے کی دعوت دیتا ہے۔ اسلام ہمیں بتاتا ہے کہ زندگی کے مابعد الطبیعی حقائق کا براہ راست علم انبیاء کو بذریعہ

وحی دیا گیا ہے اور انبیاء اس بات پر مامور ہیں کہ وہ ان حقائق سے انسان کو آگاہ کریں۔ تمام انسانوں کو ان کا براہ راست علم دینا انسان کی آزمائش کے مقصد کے خلاف ہے اگر اللہ تعالیٰ ان تمام مخفی حقائق کا براہِ راست علم ہر انسان کو دے دیتا تو پھر انسان کی آزمائش کا کوئی موقع ہی باقی نہ رہتا۔ اللہ تعالیٰ نے انبیاء کی زبان سے انسان کو زندگی کی بنیادی حقیقتوں کی خبر دی ہے اور اسے اس بات کی دعوت دی ہے کہ وہ کائنات میں ہر طرف پھیلے ہوئے آثار وشواہد کا مطالعہ کرے اور ان میں غور وفکر کر کے یہ دیکھے کہ آیا وہ ان حقائق کی تصدیق کرتے ہیں یا نہیں۔ اگر کوئی شخص یہ چاہے کہ وہ اپنے حواس کے ذریعے سے ان حقائق کی صداقت یا عدم صداقت کا تعین کرے تو یہ ناممکن ہے کیونکہ انسانی حواس ان حقائق کا احاطہ نہیں کر سکتے۔ اسی طرح مجرد انسانی عقل نہ ان کا صحیح طرح ادراک کر سکتی ہے اور نہ ان کے بارے میں کوئی قطعی حکم لگا سکتی ہے۔ اس لیے ان کے متعلق کسی صحیح نتیجے پر پہنچنے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے آثار وشواہد میں غور وفکر اور ان کی تصدیق کی روشنی میں انبیاء کرام پر ایمان۔ اس مرحلے پر ایک مثال دیتے ہوئے مولانا نے فرمایا: ہماری اس مادی دنیا میں بعض حقائق ایسے ہیں جنہیں ہم محض آثار وشواہد کے مطالعہ کی بنیاد پر مانتے ہیں ورنہ وہ ہمارے حواس کی گرفت سے باہر ہیں۔ مثلاً قانون کشش ثقل سائنس کا ایک مشہور قانون ہے جس سے مراد یہ ہے کہ چیزیں بلندی سے زمین کی کشش کی وجہ سے گرتی ہیں۔ اب یہ زمین کی کشش کوئی ایسی چیز نہیں ہے جسے حواس کی مدد سے چھو کر یا چکھ کر یا دیکھ کر معلوم کیا جا سکے لیکن اس کے باوجود سبھی اس امر کو تسلیم کرتے ہیں۔ اس کی وجہ محض یہ ہے کہ آثار وشواہد اس بات کی تصدیق کرتے ہیں کہ واقعی زمین میں کوئی قوت جاذبہ موجود ہے جس کے ساتھ وہ چیزوں کو اپنی طرف کھینچتی ہے۔ اب اگر کوئی شخص ان شواہد سے آنکھیں بند کر کے محض فلسفیانہ انداز میں سوچنے بیٹھ جائے کہ آیا قانون کشش ثقل کوئی حقیقی چیز ہے یا نہیں اور اسے اس قانون کو درست تسلیم کرنا چاہیے یا نہیں؟ تو ظاہر بات ہے کہ یہ کوئی معقول حرکت نہیں ہے اور نہ کوئی ایسا کام ہے جسے علمی بحث قرار دیا جا سکتا ہو۔

فکری آزادی کا موضوع ختم ہوا تو ایک صاحب نے بنیادی اقدار کے سلسلے میں مغربی مفکرین کے ایک فلسفے کا ذکر کیا انہوں نے کہا: مولانا بعض مغربی مفکرین اور فلاسفر یہ کہتے ہیں کہ اقدار تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور کوئی قدر دائمی نہیں یہ بات کہاں تک درست ہے؟

مولانا نے فرمایا: جو شخص یہ کہتا ہے کہ اقدار تبدیل ہوتی رہتی ہیں اور کوئی قدر دائمی نہیں اسے فلسفے کی ہوا بھی نہیں لگی۔ کیا کوئی بڑے سے بڑا فلسفی اٹھ کر یہ دعویٰ کر سکتا ہے کہ ایک ہزار سال یا پانچ ہزار سال پہلے سچ بولنا نیکی تھا لیکن اب اسے گناہ مان لینا چاہیے یا پہلے بدکاری ایک گناہ تھی اور اب وہ عین ثواب کا کام ہو گئی ہے؟

ایک نوجوان طالب علم جو ڈارون کے نظریہ ارتقاء کا خاصا تفصیلی مطالعہ رکھتے تھے کافی دیر تک مولانا سے متعدد سوالات پوچھتے رہے جن کے تسلی بخش جوابات پا کر مطمئن ہو گئے۔ تاہم فنی قسم کے سوالات سے ہٹ کر اب انہوں نے ایک عام اصولی سوال ان الفاظ میں پیش کیا: مولانا! ڈارون کے نظریہ ارتقاء کی سائنٹیفک غلطیوں اور خامیوں سے قطع نظر اسے درست تسلیم کر لینے سے کیا کوئی اخلاقی قباحت بھی پیدا ہوتی ہے؟

مولانا نے فرمایا: اگر ایک دفعہ یہ تسلیم کر لیا جائے کہ انسان ایک ترقی یافتہ حیوان ہے جو ہزاروں، لاکھوں سال کے ارتقائی عمل کے نتیجے میں یہاں تک پہنچا ہے تو بنیادی طور پر وہ خود کو منجملہ دیگر حیوانات کے ایک حیوان ہی قرار دے گا جیسا کہ فی الواقع ڈارونزم کے ماننے والوں نے اُسے قرار دیا ہے۔ اس تصور کے ذہن مں جاگزیں ہوتے ہی وہ انسانیت کے شرف سے محروم ہو کر حیوانات کی سطح پر جا پہنچتا ہے۔ پھر ایک منطقی تقاضے کے مطابق وہ اپنی زندگی کے لیے اصول اور قاعدے بھی حیوانی زندگی ہی سے اخذ کرتا ہے اور حیوانوں کے سے طور طریقے اختیار کرتا ہے۔ مغرب کی مادی تہذیب کی پیدا کردہ اخلاقی پستی کا اصل سرچشمہ یہی تصور ہے۔

ایک صاحب نے کہا: مولانا! کیا اس نظریے نے عمومی اخلاقی پستی پیدا کرنے کے علاوہ عالم انسانیت کو دوسرے نقصانات بھی پہنچائے ہیں؟

مولانا نے فرمایا: اس حیوانی ارتقاء کے تصور سے جس نام نہاد معاشرتی ارتقاء کے تصور نے جنم لیا ہے اس نے انسان کو ذلت و پستی اور ہلاکت کے گڑھے میں دھکیل دیا ہے۔ نظریۂ ارتقاء کے حامیوں نے حیوانی زندگی میں بقائے اصلح کی کارفرمائی کا جو اصول پیش کیا ہے اس نے بعض قوموں کے اندر اس جنون کی پرورش کی کہ وہ دنیا میں اصلح ہیں اور دوسری قوموں کو مغلوب کرنے اور ان پر اقتدار جمانے اور تفوق ثابت کرنے کا حق رکھتی ہیں۔ چنانچہ آپ نے دیکھا کہ اس صدی کی دو عظیم جنگیں اسی جنون کی شاخسانہ تھیں۔ نیشنلزم کی لعنت نے اسی

نظریے کی کوکھ سے جنم لیا اور عملاً اس وقت دنیا میں جو ’’جس کی لاٹھی اس کی بھینس‘‘ کے اصول کا دور دورہ ہے تو وہ اسی باطل نظریے کا براہِ راست نتیجہ ہے۔ آپ یہ جان کر حیران ہوں گے کہ مغربی قومیں اسرائیل کا جواز بھی یہی پیش کرتی ہیں کہ اسرائیل والے عربوں سے زیادہ باصلاحیت ہیں اس لیے انہیں اپنی حکومت بنانے اور عربوں کو مغلوب کرنے کا حق پہنچتا ہے۔ گویا جس طرح ایک طاقتور درندے کا کمزور درندے کو پھاڑ کھانا ان کے نزدیک بقائے اصلح کے قانون کے مطابق درست ہے اسی طرح ایک طاقتور قوم کا دوسری کمزور قوم کو زیر کر لینا اور اسے زبردستی اپنا محکوم اور غلام بنا لینا عین حق اور فطرت کے مطابق ہے۔ یہ ہیں ڈارون کے نظریۂ ارتقاء کو درست تسلیم کر لینے کے منطقی نتائج جو اس وقت دنیا میں عملاً بھی ہر جگہ رونما ہو چکے ہیں۔

کچھ توقف کے بعد فرمایا: دو نظریے ایسے ہیں جنہوں نے انسانیت کی ایسی تذلیل کی ہے کہ کسی اور نظریے نے نہیں کی۔ ایک یہ نظریہ ارتقاء جس نے انسان کو حیوانیت کی سطح پر گرا دیا۔ پہلے اسے انسانی شرف سے محروم کیا اور پھر اسے دنیا میں ایک شترِ بے مہار بنا دیا اور دوسرا نظریہ اشتراکیت ہے جس نے عام انسان کو عمل کی آزادی سے محروم کر کے ایک ایسی مجبور محض مخلوق بنا کر رکھ دیا جو نہ اپنی آزادی اور پسند کے مطابق کوئی نیکی اختیار کرنے کے قابل ہے اور نہ بدی سے بچنے کی طاقت رکھتی ہے۔ پہلے نظریے نے انسان کو ہر قید و بند سے آزاد کر دیا اور دوسرے نظریے نے اسے ہر اعتماد سے محروم کر دیا۔ انسان کو حیوان سمجھنے کے معاملے میں یہ دونوں متفق ہیں۔

بقیہ: پاکستانی نظامِ تعلیم کے تین ناسور

چنانچہ مغرب کی فکری غلامی کی وجہ سے ہمیں آج انگریزی میڈیم، او اے لیول کے امتحانات اور مخلوط تعلیم جیسے ناسور چبھتے ہی نہیں۔ یہ ہمارے لیے بتدریج قابل قبول ہو گئے ہیں۔ اب ان کے لیے ہمارے اندر ناگواری اور ناپسندیدگی کا احساس بھی نہیں ابھرتا چنانچہ یہ کینسر زدہ غذائیں ہمارے کھانے پینے کے ماحول کا معمول بن گئی ہیں۔ اور افسوس تو اس بات کا ہے کہ دین دار والدین تو رہے ایک طرف اب تو دینی جماعتوں کے کئی کارکن اور بعض علماء کرام بھی دینی مدارس کے ساتھ ساتھ اس طرح کے سکول کالج چلا کر دنیا اور آخرت دونوں کے منافع سمیٹ رہے ہیں ؎ چوں کفر از کعبہ برخیزد کجا ماند مسلمانی

تعلیم و تربیت

ڈاکٹر محمد امین

پاکستانی نظامِ تعلیم کے تین ناسور

انگلش میڈیم، او اے لیول، مخلوط تعلیم

پاکستان کے نظام تعلیم کو کینسر جیسی جن مہلک بیماریوں نے گھیر رکھا ہے اور وہ خون کے سرخ ذرات (یعنی تعلیم کے تعمیری اور اسلامی تصور) کو جس طرح چاٹ رہی ہیں، ان کا اگر بر وقت علاج نہ کیا گیا تو یقیناً تیزی سے مریض کی صحت جواب دیتی چلی جائے گی اور وہ لب گور پہنچ جائے گا۔ یہ تین مہلک امراض ہیں: انگریزی میڈیم، او اے لیول کے امتحانات اور مخلوط تعلیم۔ ہم یہاں ان تین مہلک امراض کے اثراتِ بد کا مختصر تذکرہ کریں گے تا کہ مریض کے لواحقین میں اگر کسی کے ہاں عقل نام کی کوئی چیز پائی جاتی ہے تو وہ مریض کی زندگی بچانے کی فکر کریں۔

انگریزی میڈیم

انگریزی ذریعہ تعلیم کے مہلک اثرات

۔ طلبہ کو مغرب کا فکری غلام بنانا (کیونکہ انگریزی ذریعۂ تعلیم کا لازمی نتیجہ ہے مغرب سے مرعوبیت، اہل مغرب کی نقالی اور مغربی تمدن و روایات کو اپنانا)۔

۔ شرح تعلیم میں شدید کمی (کیونکہ بچے انگریزی میں فیل ہو کر تعلیم چھوڑ دیتے ہیں)۔

۔ رٹّے بازی کی عادت (کیونکہ بچے کو اجنبی زبان کی وجہ سے مفہوم سمجھ نہیں آتا لہٰذا وہ سبق کو رٹنے پر مجبور ہو جاتا ہے جس کے نتیجے میں اس کی تخلیقی صلاحیتیں کچلی جاتی ہیں)۔

۔ شام کی اکیڈمیوں اور ٹیویشن سنٹرز کا فروغ (کیونکہ انگریزی نہ والدین کو آتی ہے اور نہ بچوں کو سکول میں سبق کی کچھ سمجھ آتی ہے لہٰذا والدین مجبور ہیں کہ وہ بچوں کو شام کی اکیڈمیوں اور ٹیوشن سنٹروں میں بھیجیں۔ اس سے والدین پر دُہرا مالی بوجھ پڑتا ہے۔ اساتذہ نے چونکہ شام میں بھی بچوں کو پڑھانا ہوتا ہے لہٰذا وہ دن کے وقت محنت سے جی چراتے ہیں۔

او اے لیول کے امتحانات اور ان کے اثراتِ بد

- مقامی نظام امتحانات (میٹرک، ایف اے) کی تحقیر اور اسے ناکام بنانا (اس کے لیے باقاعدہ پلاننگ سے مقامی امتحانی نظام کو بے توقیر کیا گیا۔ پرچے آؤٹ، نقل اور بوٹی مافیا کے چرچے، امتحانی سنٹروں پر میڈیا ٹیموں کے ساتھ چھاپے، کثیر تعداد میں طلبہ کا فیل ہوجانا، تعلیم کے غیر معیاری ہونے کی پبلسٹی وغیرہ)۔
- غیر ملکی نصاب کی پیروی اور تدریس جو اصلاً غیر مسلم طلبہ کے لیے بنایا گیا ہے اور جس کے مواد کا مسلمان پاکستانی بچوں کے لیے غیر موزوں ہونا ظاہر و باہر ہے۔
- ملک کے قیمتی زرمبادلہ کا ضیاع
- مغرب اور اس کے نظام تعلیم سے مرعوبیت، اس کے اعلیٰ و برتر ہونے کا تصور، اس پر فخر کا احساس

مخلوط تعلیم کے مہلک اثرات

- طلبہ وطالبات کے ایمان واخلاق کا بگاڑ
- فیشن، فحاشی، عریانی اور زنا کے کلچر کا فروغ
- تعلیم میں سنجیدگی کا خاتمہ، لڑکیوں کو مرد اساتذہ سے بآسانی زیادہ نمبر مل جانا
- اس کا کم سے کم نقصان ہے حیاء کا خاتمہ اور قرآن کے غضِ بصر کے حکم کی نافرمانی

سب سے بڑا نقصان

انگلش میڈیم، او اے لیول کے امتحانات اور مخلوط تعلیم کا لازمی اور منطقی نتیجہ ہے مغرب کی فکری غلامی۔ اور فکری غلامی کا سب سے بڑا نقصان یہ ہوتا ہے کہ احساسِ زیاں ختم ہوجاتا ہے بقول اقبال ؂

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

(بقیہ صفحہ نمبر:۱۶)

تعلیم وتربیت

پروفیسر ملک محمد حسین

عصرِحاضر میں اعلیٰ تعلیم

علم کا حصول تمام مسلمان عورتوں اور مردوں پر فرض کیا گیا ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن میں تحصیل علم ایک ایسی سرگرمی ہے، جو ساری زندگی جاری رہتی ہے۔ علم کا حصول اگرچہ جملہ مسلمانوں کے لیے ایک فریضہ کی حیثیت رکھتا ہے لیکن تمام علوم کا حصول فرض کے دائرے میں نہیں آتا۔ علم کا وہ حصہ جو ایک مسلمان کی حیثیت سے کامیاب زندگی گزارنے کے لیے ضروری ہے، فرض عین کا درجہ رکھتا ہے جبکہ اس سے زائد علم یا اس کے کسی جزو کا حصول فرض کفایہ ہے اور معاشرے کی ضروریات کے مطابق بعض افراد معاشرہ اگر اس کا اکتساب کرلیں تو فرض کی ادائیگی مکمل تصور ہوگی۔ ان تصریحات کے مطابق اعلیٰ تعلیم فرض کفایہ کا درجہ رکھتی ہے اور تمام افراد معاشرہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے مکلّف نہیں ہیں۔

جامعات اعلیٰ تعلیم دینے کی خاطر قائم کی جاتی ہیں۔ انسانی معاشرے میں جامعہ کا کردار ایک گائیڈ پوسٹ کے کردار کی مانند ہے، جو قوم کو اعلیٰ سے اعلیٰ تر منازل کی نشاندہی کے ساتھ ساتھ انہیں حاصل کرنے کا راستہ بھی مہیا کرتی ہیں اور تہذیب وتمدن میں نکھار پیدا کرتی ہیں۔ مسائل ومشکلات کو حل کرنے کے لوازمات مہیا کرتی ہیں اور تحقیق وترقی کی راہیں پیدا کرتی ہیں۔ تلاش وجستجو اور فکر واجتہاد کی مہمیز دینے کے ساتھ ساتھ اس کی نشوونما کرتی ہیں اور زندگی کو نئی جہتوں سے آشنا کرتی ہیں۔ جامعات جمود کی ضد اور تعمیری تغیر کا نشان ہوتی ہیں۔ کسی معاشرے کی ترقی کی رفتار اور اس کی ذہنی، فکری اور روحانی صحت مندی کا انحصار اعلیٰ تعلیم کے ان مراکز پر ہوتا ہے۔ غرض یہ کہ معاشرے کی زندگی کا انحصار علم پر اور علم کی تنومندی کا انحصار جامعات کے متحرک کردار پر ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی فلسفیانہ بنیادیں

فلسفیانہ نقطہ نگاہ کے مطابق اعلیٰ تعلیم کی دو مختلف بنیادیں ہیں۔ پہلے نقطۂ نگاہ کے مطابق اعلیٰ تعلیم کا جواز یا جامعات کے تعلیمی پروگراموں کی بنیاد (Epistemological) یعنی علم برائے علم کی بنیاد ہے۔ اعلیٰ تعلیم کے جواز اور نوعیت کی دوسری بنیاد (Political) یعنی سیاسی

بنیاد ہے۔ پہلے نقطۂ نگاہ کے مطابق جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا قیام محض علم برائے علم کی بنیاد پر عمل میں لایا جاتا ہے۔ اس میں تہذیبی تعصّبات (Cultural Biases)، قومی ضروریات وترجیحات، نظریاتی اقدار اور انفرادی خواہشات کی منہاج تعلیم میں کوئی عمل دخل نہیں ہوتا۔ تحقیق اور تحصیل علم، بذات خود ایک اعلیٰ قدر کے طور پر سرانجام پاتا ہے۔ یہ سارا عمل Value Free یعنی اقدار کی قید سے آزاد ہوتا ہے۔ دوسرا نقطۂ نگاہ یعنی جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کا سیاسی فلسفہ کی بنیاد پر قیام اس امر کا متقاضی ہوتا ہے کہ حصول علم اور تحقیق وترقئ علم قومی ضروریات اور قومی ترجیحات کے تابع ہو۔ معاشی اور معاشرتی مسائل حل کرنے میں مدومعاون بنے، قومی تفاخر میں اضافہ کرے، سائنس اور ٹیکنالوجی کے لیے ترقی کی راہیں کھولے اور قوموں کی برادری میں سرفرازی کا باعث بنے۔ یہ نقطۂ نگاہ یعنی اقدار کی قید سے آزاد نہیں ہوسکتا۔ اس میں قومی نظریہ حیات اور معاشرتی اقدار اہم رول ادا کرتی ہیں۔ سائنس اور ٹیکنالوجی کی ترقی ایک متعین جہت میں ہوتی ہے اور یہ قومی وبین الاقوامی روابط پر بھی اثر انداز ہوتی ہے۔

اعلیٰ تعلیم کی یہ دونوں فلسفیانہ بنیادیں مطلق انداز میں نہ ممکن ہیں اور نہ پسندیدہ۔ ان دونوں نقطہ ہائے نگاہ کا ایک حسین امتزاج ہی اعلیٰ تعلیم کو ایک صحت مند رخ عطا کرسکتا ہے۔ Epistomoligical بنیاد ''علم'' کو کوئی قابل اعتبار Valid Criterion (معیارِ کار) عطا نہیں کرسکتی۔ حقیقت کی تلاش اور حقیقت مطلقہ کے مطابق حاصل شدہ علم کی پرکھ اس کے لیے ایک لاینحل مسئلہ رہتی ہے کیونکہ اس نظریہ کے مطابق حقیقت مطلقہ (Absolute Reality) کا علم، اہل علم کے پاس نہیں ہوتا۔ لہٰذا وہ روشنی کی تلاش جہالت کے اندھیروں سے کرنے میں سرگرداں رہتے ہیں۔ خالص سیاسی بنیادوں پر علم کی تشکیل وجستجو بھی کلی طور پر مستحسن نہیں ہے، اس سے محدود اور متعصب نظریات جنم لیتے ہیں۔ گروہی اور بین الاقوامی تضادات میں اضافہ ہوتا ہے اور علم ایک بے رحم ہتھیار کے طور پر دہشت گردی اور استحصال کا ذریعہ بن جاتا ہے۔

مذکورہ بالا دونوں نقطہ ہائے نگاہ کا متوازن امتزاج اسلامی نظریۂ تعلیم میں موجود ہے۔ اسلام انسان کو حقیقت مطلقہ کا علم دے کر اور اللہ سبحانہ وتعالیٰ کی طرف سے ہدایت کی روشنی عطا

کر کے اسے اس قابل بناتا ہے کہ وہ اپنی تلاش وجستجو سے حاصل کیے ہوئے علم کو علم وحی کی آفاقی سچائی کی کسوٹی پر پرکھے اور اس کے حسن وقبح کا جائزہ لے کر علمی ترقی کو آگے بڑھائے اور اپنی علمی غلطیوں کا ادراک کر کے تلاشِ مسلسل کا جذبہ حاصل کرے۔ دوسری طرف اسلام ایک آفاقی نظریۂ حیات ہے اور تمام انسانوں کو مخاطب کرتا ہے۔ اس میں محدود گروہی، نسلی، لسانی یا جغرافیہ پر مبنی قومی تعصّبات کے لیے کوئی جگہ نہیں۔ اس لیے اس نظریۂ حیات پر مبنی معاشرتی ترجیحات آفاقی ہوں گی اور تحقیق اور ترقی کے ثمرات بھی پوری نوع انسانی کے لیے میسر ہوں گے۔ اسلامی نظریۂ حیات اعلیٰ تعلیم کے لیے جو فلسفیانہ بنیاد فراہم کرتا ہے، وہ علمی بھی ہے اور سیاسی بھی، اس میں آفاقیت بھی ہے اور متعین سمت بھی۔ اسلامی معاشرے میں جامعات بنی نوع انسان کی انفرادی اور اجتماعی دونوں حوالوں سے مکمل نشوونما، تیز رفتار مادی ترقی اور ربّ العالمین کی مکمل بندگی کی فلسفیانہ بنیاد پر ہوں گی۔ جامعات اور اعلیٰ تعلیمی اداروں کی فلسفیانہ بنیاد ان کے نصاب تعلیم، ان اداروں کی سماجی زندگی اور ان کے انتظامی ڈھانچے کے لیے رہنمائی فراہم کرتی ہے۔

قرآن حکیم میں نبی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کے جو معلمانہ فرائض گنوائے گئے ہیں، ان میں آیات کا پڑھ کر سنانا، تزکیۂ نفس کرنا، کتاب کی تعلیم دینا اور حکمت کی تعلیم دینا شامل ہیں۔ ہمارے خیال میں تعلیم کے یہ چار عناصر جہاں پورے نظام تعلیم کے لیے رہنمائی فراہم کرتے ہیں وہاں اعلیٰ تعلیم یا جامعات کے تعلیمی پروگراموں کے لیے خصوصی اہمیت کے حامل ہیں۔ خاص طور پر حکمت کی تعلیم تو وہ عمل تعلیم ہے، جس کا تعلق علم کے فہم کے ساتھ ساتھ تجزیہ، تحقیق، تفکر، تدبر، نئی راہوں کی تلاش وجستجو اور مسائل کے حل کے لیے اطلاقِ علم سے ہے۔ اسلامی معاشرے میں قرآن حکیم کی یہ بلیغ اصطلاح جامعات کا کردار متعین کرتی ہے۔ جامعات سے فارغ التحصیل نوجوان کو حکیمانہ طرز فکر اور حکیمانہ طرز عمل کا حامل نوجوان ہونا چاہیے۔

اگر ہم مسلمانوں کی علمی روایات کی تاریخ پر نظر ڈالیں، تو مسلم مفکرین، سائنس دان، اطباء، محدثین، فقہا اور علمائے دین حکمت کا بہترین مرقع نظر آتے ہیں۔ ان کے حکیمانہ طرز عمل کا جب ہم مطالعہ کرتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ایک خاص سطح تک تمام علوم پر دسترس رکھتے تھے اور اپنے شعبہ میں حکیمانہ بصیرت کے لیے ضروری روشنی وہ اپنے Broadbase

Konwledge سے حاصل کرتے تھے جو انہوں نے کسی شعبہ میں تخصص حاصل کرنے سے پیشتر حاصل کیا تھا۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ مسلمانوں کی علمی روایت مختلف شعبہ ہائے علم کی یکجائی کی زیادہ قائل ہے۔ اسلام میں نظریہ توحید، اسلامی نظام حیات کے ہر پہلو میں رہنما نظریہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ توحید باری تعالیٰ، وحدت کائنات، وحدت حیات اور وحدتِ علم کی متقاضی ہے۔ علوم کی موجودہ شعبہ جاتی تقسیم کائنات کا آفاقی فہم حاصل کرنے میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے۔ مسائل زندگی کو حکمت وبصیرت کے ساتھ حل کرنے کے لیے علوم وفنون کی موجودہ صورتِ حال سے دوچار علماء اور محققین عاجز نظر آتے ہیں۔ اس لیے عصر حاضر کے اعلیٰ تعلیمی ادارے اپنے تعلیمی پروگراموں کی کثیر شعبہ جاتی (Multi Disciplinary) اور بین شعبہ جاتی (Inter Disciplinary) اپروچ کے مطابق از سر نو تشکیل کر رہے ہیں۔ علم کی دنیا میں عصر حاضر کا یہ نیا رجحان اسلامی علمی روایت کی طرف مراجعت قرار دیا جا سکتا ہے۔ اسلامی تہذیب وتمدن میں ''حکمت'' اور حکیمانہ رویے کا جو مطلب سمجھا جاتا رہا ہے وہ یہی ہے کہ وسیع البنیاد علم، کثیر الجہات علم یا بین شعبہ جاتی علم کی بنیاد پر تجزیہ وترکیب سے کام لے کر مسائل کا حل دریافت کیا جائے۔

مغرب نے علم کی روشنی، اسلام کے دور عروج کے اعلیٰ تعلیمی اداروں سے حاصل کی لیکن وقت کے ساتھ ساتھ علوم وفنون سے حکمت غائب ہوتی گئی اور میکانکی تحقیق اور شعبہ جاتی تقسیم آہستہ آہستہ اپنی انتہا کو پہنچتی گئی۔ مغربی مفکرین، ماہرین تعلیم اور جامعات کے ذمہ داران نے بھی اب اس علمی حماقت پر غور کرنا شروع کر دیا ہے۔ تحقیقی طریق کار میں میکانکی اور ریاضیاتی رویوں کے خلاف ایک آواز اٹھ رہی ہے، علم کی شعبہ جاتی تقسیم اور اعلیٰ تعلیم میں محدود تخصص کے خلاف ایک توانا ردّعمل سامنے آ رہا ہے۔ مغربی جامعات میں اب بین شعبہ جاتی اپروچ پر مبنی شعبہ جاتی، ریسرچ سنٹرز اور تعلیمی پروگرامز زیادہ سے زیادہ تعداد میں سامنے آ رہے ہیں۔ اعلیٰ تعلیم سے متعلق لٹریچر کی کثیر شعبہ جاتی اور بین شعبہ جاتی اپروچ کے مطابق نصابات اور تعلیمی پروگراموں کی تدوین نو کی باتیں ہو رہی ہیں۔

جدید زندگی پیچیدہ تر ہوتی جا رہی ہے۔ پوری دنیا نے ایک گلوبل ویلج کی شکل اختیار کر لی ہے۔ معلومات اور نظریات کا ابلاغ ناقابل تصور حد تک تیز رفتاری سے ہو رہا ہے۔ ماحول کی

آلودگی، ٹیکنالوجی کی وجہ سے استحصال، صحت اور خوراک کے مسائل، معاشی عدم توازن، سماجی ناہمواریاں، اعصابی تناؤ اور اس طرح کے دیگر سینکڑوں مسائل ایک ہمہ گیر حکمت کو بروئے کار لائے بغیر حل ہوتے نظر نہیں آتے۔ ہمہ گیر حکمت کے تحت ان اذہان کی تیاری جامعات کا کام ہے جو ان کے ہمہ گیر اور وسیع بنیادوں پر علمی پروگراموں کے ذریعے سے ہی ممکن ہے۔

ترقی پذیر معاشرے میں جامعات کا کردار

ترقی یافتہ معاشرے اپنی ترقی کے لیے علوم وفنون کی اعلیٰ درسگاہوں کے مرہون منت ہیں۔ مغرب کی خیرہ کن ترقی، امریکہ کا دنیا میں قائدانہ کردار اور جاپان، کوریا اور چائنا کی دنیا پر چھائی ٹیکنالوجی اور معاشی فتوحات، جامعات اور اعلیٰ تعلیم کے دیگر اداروں کی کاوشوں کا نتیجہ ہیں۔ ترقی پذیر معاشرے محض نقالی اور ٹیکنالوجی ٹرانسفر کی بھیک سے بلندیوں کی طرف بھاگتی ترقی یافتہ دنیا کا ساتھ نہیں دے سکتے۔ جب تک جامعات میں کیا گیا بنیادی علمی کام، ٹھوس بنیاد فراہم نہیں کرے گا تب تک کوئی ترقی پذیر معاشرہ تیز رفتار ٹیکنالوجیکل دوڑ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ ان معاشروں میں جامعات کو نہ صرف ترقی یافتہ معاشروں کی جامعات کا سا رول ادا کرنا ہے، بلکہ ترقیاتی خلا کو پاٹنے کے لیے خصوصی حکمت عملی بھی وضع کرنا ہے۔ اس مقصد کے لیے جاپان، کوریا اور چین کی عملی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔

ترقی پذیر معاشروں میں صرف مادی پس ماندگی کے مسائل ہی نہیں ہیں بلکہ ان کے ہاں بے شمار معاشرتی مسائل بھی ہیں جو جدید اور قدیم طرز زندگی کے تضادات سے پیدا ہو رہے ہیں۔ ان کے ہاں قومی تشخص اور قومی نظریہ کو جدید تناظر میں تعبیر نو کرنے کا مسئلہ بھی ہے۔ یہ اور اس جیسے سیکڑوں مسائل ہیں جن کے حل کے لیے جامعات نے علمی و عملی رہنمائی فراہم کرنا ہے۔ ان معاشروں میں مقامی وسائل کو بروئے کار لانے کا مسئلہ بھی ہے جو ترقی کی دوڑ میں ان کے حقیقی معاون ثابت ہو سکتے ہیں۔

اسلامی معاشرے میں جامعات کا کردار

اسلامی معاشرہ ایک فلاحی شورائی معاشرہ ہوتا ہے جس میں علم کے حصول، اس کی ترویج وترقی اور تحقیق وجستجو کو بڑی اہمیت حاصل ہے۔ عام انسان کی فلاح اس بات کا تقاضا کرتی ہے

کہ سائنس اور ٹیکنالوجی میں تحقیق وترقی کے ساتھ انسانی روابط، معاشرتی تعلقات اور ان سے متعلق معاشرتی مسائل پر بھی تحقیق کی جائے۔ اسلام دنیا میں قیادت کرنے کے لیے اور تمام باطل ادیان پر غلبہ حاصل کرنے کے لیے آیا ہے۔ قیادت اور غلبہ کا یہ کام علم کی قوت کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ اللہ تعالیٰ نے ان شعبہ ہائے علم کے متعلق انسان کی وحی کے ذریعے معلومات بہم پہنچادی ہیں جن تک انسان کی رسائی یا تو ناممکن تھی اور یا محدود رسائی کی وجہ سے صحیح نتائج تک پہنچنا ناممکن تھا، لیکن علم کی ان دنیاؤں کو انسان کی تحقیق وجستجو اور مطالعہ ومشاہدہ کے لیے کھلا چھوڑ دیا ہے جنہیں جاننے کے لیے اللہ تعالیٰ نے انسان کو صلاحیتیں ودیعت کردی ہیں اور ساتھ ہی ان صلاحیتوں کو بھرپور طور پر استعمال کرنے کی قرآن حکیم میں بار بار تلقین بھی کی ہے۔ پس اسلامی معاشرے میں علمی تحقیق اور جستجو قیادت وسربلندی کا اوّلین زینہ ہے۔ اللہ کے نائب کی حیثیت سے اور شورائی تصورِ مملکت اور انتظام کی بدولت ہر مسلمان کے لیے لازم ہے کہ وہ اجتماعی معاملات اور کارہائے مملکت میں رائے دینے کا اہل ہو، صحیح فیصلہ کرسکے اور اپنی قوت فیصلہ حق کے پلڑے میں ڈال سکے۔ گویا بعض معاملات میں ہر فرد اور بعض معاملات میں افراد کی ایک جماعت معاملاتِ زندگی، مسائلِ حیات اور اختلافی ونزاعی معاملات میں اہل الرائے کا درجہ رکھتی ہو۔

یہ سب کچھ وسیع علم، درست طریقِ استنباط اور موثر صلاحیتِ ابلاغ پر مبنی ہے۔ علم اور اس کی ہمہ پہلو ترویج ان تمام ضروریات کی بنیاد ٹھہرتی ہے۔ جامعات علم کی انہی ضروریات کو پورا کرتی ہیں اور کوئی بھی اسلامی معاشرہ جامعات کے اس متحرک کردار کے بغیر نہ تو قائم رہ سکتا ہے اور نہ قیادت وغلبہ کا تصور ہی کرسکتا ہے۔ جامعات علمی بنیاد پر مسائل کا حل پیش کرتی ہیں اور معاشرے کو خوشحال بنانے کے لیے اپنا کردار ادا کرتی ہیں۔ جامعات کے لیے تدوین نصاب میں ہمیں سب سے پہلے یہ دیکھنا ہوگا کہ عصر حاضر کے اسلامی معاشروں کے وہ کون کون سے مسائل ہیں جو اہل علم کی توجہ کا باعث ہونے چاہئیں اور جو اسلامی معاشروں کے لیے اعلیٰ تعلیم کی ضرورت اور نوعیت کی نشاندہی کرتے ہیں۔ ان کا مختصر اً خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے:

۱۔ مسلم ممالک عام طور پر بیماری، غربت اور جہالت کا شکار ہیں۔

۲۔ سیاسی عدم استحکام تقریباً اکثر ممالک کا اوّلین مسئلہ ہے۔

۳۔ مسلم ممالک مجموعی طور پر بیرونی جارحیت کا شکار ہیں یا اس کے خوف میں مبتلا ہیں۔

۴۔ سائنس اور ٹیکنالوجی یعنی مادی ترقی کی دوڑ میں مسلمان معاشرے آخری صفوں میں کھڑے نظر آتے ہیں۔

۵۔ اندرونی سیاسی، معاشرتی اور معاشی تضادات مسلمان معاشروں کو ہر پہلو سے تناؤ میں مبتلا کرنے کا باعث ہیں۔

۶۔ جاہلی نظریات کا نفوذ مسلمان معاشروں کی جڑیں کھوکھلی کر رہا ہے اور نظریاتی آلودگی ایک اہم مسئلہ ہے۔

۷۔ جاہلی نظریہ ہائے حیات کے مقابلہ میں بزدلانہ اور معذرت خواہانہ روّیہ مسلم امت کو باوقار تشخص کو بُری طرح مجروح کر رہا ہے۔

۸۔ جدید عمرانی، معاشی اور ٹیکنالوجیکل تناظر میں اسلامی نظریۂ حیات کی ترجمانی اور اطلاق کے سلسلے میں مسلمان معاشرے علمی تہی دامنی کا شکار ہیں۔

۹۔ بعض اسلامی معاشرے اور ممالک جاہلی بنیادوں پر آپس میں مسلح ٹکراؤ کا شکار ہیں

۱۰۔ دشمن، اسلامی دنیا کے وسائل کا بری طرح استحصال کر رہا ہے۔

اجتماعی مسائل کے ساتھ ساتھ اگر ہم مسلمان نوجوان کی انفرادی ضروریات پر بھی نظر ڈالیں تو جامعات کا علمی کردار متعین کرنے میں ہمیں آسانی ہوگی اور تعلیمی و تحقیقی منہاج متعین کرنے میں رہنمائی ملے گی۔

ایک مسلمان نوجوان کی بعض اہم انفرادی ضروریات کا خاکہ درج ذیل ہے:

۱۔ ایک مسلمان، مومن اور مجاہد فرد کی حیثیت سے بندگی ربّ کے تقاضے پورے کرنے کی خاطر اسلامی نظریۂ حیات کی ضروری معلومات اور ان معلومات کو اپنے روزمرہ عمل میں ڈھالنے کا جذبہ۔

۲۔ عصرِ حاضر کے تقاضوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے جدید دنیا کا عمومی علم۔

۳۔ تنقیدی اور تحقیقی ذہن۔　　۴۔ خود اعتمادی اور مسلمان ہونے پر فخر۔

۵۔ پیداواری صلاحیتوں سے مزین صحت مند شخصیت۔

۶۔ نئے علوم کی دریافت اور تحقیقی سرگرمیاں اختیار کرنے کی صلاحیت اور جذبہ۔

۷۔ قیادت وسیادت کی اہلیت۔ ۸۔ موثر ابلاغ کی صلاحیت۔

جیسا کہ اس سے پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ اسلام دنیا میں قیادت کے لیے آیا ہے اور تمام ادیان باطل پر غلبہ حاصل کرنے کا فرض مسلمانوں پر عائد ہوتا ہے۔ مسلمانوں کا یہ فرض بھی ہے کہ وہ انسانوں کو دنیاوی خداؤں کے طوق غلامی سے آزاد کرا کرایک ربّ العالمین کی غلامی میں آنے کے لیے سوچنے کا اور فیصلہ کرنے کا آزاد موقع فراہم کریں۔ انسان کو انسان کے استحصال سے بچائیں۔ دنیا سے جہالت کے اندھیرے دور کرنے کے لیے اپنا کردار ادا کریں۔ گویا مسلمانوں کی صرف قومی ذمہ داریاں ہی نہیں ہیں بلکہ عالمی ذمہ داریاں بھی ہیں۔ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علم کا ہتھیار سب سے موثر ہتھیار ہے۔ اس پہلو سے جو تقاضے ہمارے سامنے آتے ہیں وہ یہ ہیں:

۱۔ باطل ادیان، ان کے سماجی مضمرات، نظریاتی اثرات اور ان کو ماننے والی آبادیوں کا سماجی، معاشی اور سیاسی مطالعہ۔

۲۔ بین الاقوامی تضادات، مسائل اور ٹکراؤ کا مطالعہ

۳۔ عالمی سطح پر انسانی مسائل اور قدرتی وسائل کا مطالعہ

۴۔ کمزور اور طاقتور ممالک، اقوام، معاشروں اور گروہوں کا تحقیقی مطالعہ اور ظلم واستحصال کی حکمت عملی۔

۵۔ عالمی سطح پر موثر ابلاغ کی حکمت عملی اور اسلام نظریۂ حیات کو موثر طور پر پیش کرنے کا طریق کار۔

ان مسائل اور تقاضوں پر علمی تحقیق کے لیے ہر شعبہ اور موضوع پر جامعات میں مراکز تحقیق قائم کیے جانے چاہئیں جو پوسٹ گریجوایٹ، ڈاکٹریٹ اور پوسٹ ڈاکٹریٹ سطح پر ریسرچ کی سہولتیں مہیا کریں۔ (جاری ہے)

تعلیم و تربیت پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چودہری

چیف جسٹس آف پاکستان کی خدمت میں
ایک معزز عدالت میں ایک معزز استاد، عالم دین اور پروفیسر کی فریاد

چکی نمبر 13، بیرک نمبر B-5، ڈسٹرکٹ
جیل لاہور 27 مارچ 2019ء

واجب الاحترام چیف جسٹس آف پاکستان آصف سعید کھوسہ صاحب!

السلام علیکم ورحمۃ اللہ،

بہت ادب کے ساتھ عرض ہے کہ زیر دستخطی پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری سرگودھا یونیورسٹی میں ۲۰۰۷ء سے لے کر ۲۰۱۵ء تک (آٹھ سال) وائس چانسلر تعینات رہا۔ اس دوران پاکستان مسلم لیگ (ن) کی ممبر صوبائی اسمبلی ڈاکٹر نادیہ عزیز صاحبہ ممبر سنڈیکیٹ یونیورسٹی (جو آج کل تحریک انصاف میں ہیں) کے حسب خواہش ۵۳ لاکھ روپے کا جعلی بل پاس نہ کرنے کی پاداش میں تحریک استحقاق، CMIT اور سپیشل آڈٹ کا سامنا کیا۔ بحمد اللہ میرے خلاف کبھی کوئی بدعنوانی ثابت نہ ہوسکی۔ بحیثیت وائس چانسلر میری دوسری ٹرم ۱۱ر اکتوبر ۲۰۱۵ء کو مکمل ہوئی اور میں لاہور آ گیا۔ محترمہ نادیہ صاحبہ ۲۰۱۱ء سے مختلف ذرائع سے نیب کو میرے خلاف اقدام کے لیے کہتی رہیں، انجام کار مارچ ۲۰۱۸ء میں نیب کی جانب سے انکوائری کے احکامات کا ہمیں اخبارات کے ذریعے پتہ چلا۔

بڑا الزام یہ ہے کہ میں نے پرائیویٹ پبلک پارٹنر شپ کے تحت پانچ سب کیمپس کیوں قائم کیے؟ اس سلسلہ میں عرض ہے کہ سنڈیکیٹ نے یونیورسٹی ایکٹ کی روشنی میں ایک پالیسی وضع کر کے، حکومت پنجاب کی Vetting کے بعد یہ کیمپس قائم کیے، جنہوں نے ۲۰۱۲ء سے ۲۰۱۶ء تک نہایت تسلی بخش انداز میں Affordable Education کو غریب بچوں کے دروازے تک پہنچایا۔ واضح رہے ہمارے ان اداروں میں بالعموم سمسٹر کی فیس ۳۰ ہزار

روپے سے کم تھی جبکہ جملہ پرائیویٹ یونیورسٹیاں انہی مضامین کی فیس ۸۰ ہزار روپے سے ایک لاکھ دس ہزار روپے وصول کرتی ہیں۔

میرے بعد آنے والے نئے وائس چانسلر ڈاکٹر اشتیاق احمد صاحب ہر سب کیمپس کے CEO کو بلا کر رقوم طلب کرتے رہے اور یہ کہ وہ اقبالی بیان دیں کہ وہ سابق وائس چانسلر کو (مجھے) باقاعدہ رقوم دیا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں سبھی CEOs کی ایک درخواست (بیان حلفی کے ساتھ) چانسلر/ گورنر پنجاب، چیف جسٹس آف پاکستان اور چیئرمین نیب کو پیش کی گئی جو ابھی تشنۂ توجہ ہے۔ ان CEOs سے رقوم کا مطالبہ پورا نہ ہونے کی پاداش میں یونیورسٹی انتظامیہ نے ۲۰۱۷ء ۔ ۲۰۱۸ء میں سب کیمپسز کے لیے بے شمار دشواریاں پیدا کیں اور کامیاب ہونے والے طلباء وطالبات کے امتحانات کے بعد رزلٹ روکے۔ امتحانات پاس کرنے کے باوجود رزلٹ کارڈ اور ڈگریاں نہ ملنے پر ۲۰۱۸ء میں طلباء/ طالبات احتجاج کرتے رہے۔ طلباء کا احتجاج بے قابو ہونے پر سابق چیف جسٹس صاحب نے ۵/ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو اس کا ازخود نوٹس لیا۔ تو نیب نے میرے یونیورسٹی چھوڑنے کے تین سال بعد احتجاج کو میرے ساتھ منسلک کرتے ہوئے میرے رجسٹرار بریگیڈیئر (ر) راؤ جمیل اصغر SI(M) اور دو کیمپس کے ذمے داران کل چھ افراد کو ہتھ کڑیاں لگا کر گرفتار کرلیا۔ جبکہ زیر دستخطی اکتوبر ۲۰۱۵ء میں اور بریگیڈیئر راؤ جمیل اصغر جون ۲۰۱۵ء میں یونیورسٹی چھوڑ چکے تھے۔ معاملہ یونیورسٹی کی موجودہ انتظامیہ اور سب کیمپس کی انتظامیہ کے درمیان تھا۔

سب کیمپسز کے اجراء کو غیر قانونی قرار دیتے ہوئے اور کرپشن کے الزامات میں مجھے اور رجسٹرار کو مورخہ ۸/ اکتوبر ۲۰۱۸ء کو گرفتار کرلیا گیا۔ مورخہ ۱۳ نومبر ۲۰۱۸ء کو ہماری درخواست برائے ضمانت لاہور ہائی کورٹ میں زیر غور آئی اور اس لیے ردّ کردی گئی کہ ابھی نیب نے چیف جسٹس صاحب کے ازخود نوٹس کا جواب نہیں دیا۔ ہم نے سپریم کورٹ میں ۲۳ دسمبر ۲۰۱۸ء کو ضمانت کے لیے درخواست دی جس کی اب تک سات آٹھ پیشیاں ہو چکی ہیں۔

واضح رہے کہ میرے یا بریگیڈیئر راؤ جمیل اصغر کے خلاف کسی سے رقوم وصول کرنے یا غیر قانونی سہولیات لینے کا کوئی الزام نہیں ہے، ہمیں Mis-use of Authority کے ملزم

قرار دیا گیا ہے اور یہ Mis-use بغیر مالی مفادات کے ہے۔

جناب چیف جسٹس صاحب! میرے اور میرے قرابت داروں کے مملوکہ اثاثے اور بنک بیلنس نیب کے سامنے ہیں بایں ہمہ عمر کے ۶۹ ویں سال میں یہ تذلیل، نیب کے انکوائری افسران کا حد درجہ توہین آمیز رویہ۔ اور نیب کے جج حضرات کا بات تک نہ سننا میرے لیے سوہانِ روح ہے۔ میں گزشتہ کئی سال سے بلڈ پریشر اور دل کی غیر متوازن دھڑکن کا مریض ہوں اور مارچ ۲۰۱۸ء میں اپنی بابت کرپشن کی میڈیا میں دل آزار خبروں کے بعد ۱۶ کلوگرام وزن کھو چکا ہوں۔ آپ سے درخواست ہے کہ زیر دستخطی کو کم از کم ضمانت پر فوری طور پر رہا کرنے کے احکامات جاری فرمائے جائیں۔

والسلام،

(پروفیسر ڈاکٹر محمد اکرم چوہدری)
سابق وائس چانسلر
ایم۔اے عربی (PU)، ایم اے فلسفہ (GC,PU)
پی ایچ ڈی جامعہ امّ القریٰ مکۃ المکرمہ، گلاسگو یونیورسٹی برطانیہ
فل برائٹ فیلو یونیورسٹی آف کولراڈو، یونیورسٹی آف ایری زونا امریکہ

نوٹ

۱۔ میری وائس چانسلرشپ کے دورانیے میں یونیورسٹی کی کارکردگی HEC کی رینکنگ سے معلوم کی جاسکتی ہے۔ اور میری پرسنل پروفائل کے لیے Linkedln اور گوگل Brouse کر سکتے ہیں۔

۲۔ کسی بھی وضاحت کے لیے بندہ کو طلب فرمائیں تو عین انصاف ہوگا۔

البرہان کا تبصرہ

یہ پورا نظام لعنتی ہے

نیب اور اس کا کالا قانون غیر اسلامی ہے۔ اسلام کا قانون یہ ہے کہ ہر آدمی بے گناہ ہے

جب تک اس کا جرم ثابت نہ ہو جائے۔ لیکن اس ملک میں اسلامی قانون کو کون پوچھتا ہے؟ یہ کیسا قانون ہے کہ ایک شریف آدمی کو محض کرپشن کے الزام میں پکڑ لیا جائے، اسے ہتھ کڑی لگا کر اس کی تصویریں میڈیا میں چلائی جائیں، وہ چھ مہینے سے جیل میں سڑ رہا ہے، تفتیش ابھی مکمل نہیں ہوئی، اس پر الزام کے ثبوت ابھی تک نہیں ملے کہ ریفرنس دائر ہوتا اور اس پر مقدمہ چلتا۔ چیف جسٹس صاحب اس کی ضمانت کی درخواست پر اس کے وکیل کے یہ کہنے پر کہ ملزم ایک معزز استاد اور پی ایچ ڈی پروفیسر ہے، فرماتے ہیں کہ جرم کا پی ایچ ڈی سے کیا تعلق؟.... کاش ان کا کوئی استاد ہوتا؟ سنا تھا قانون اندھا ہوتا ہے۔ واقعی نیب کا قانون اندھا ہے بلکہ یہ قانون بنانے والے، اسے نافذ کرنے والے، اس کی تشریح کرنے والے سارے اندھے ہیں۔ کاش ان میں کوئی بینا ہوتا!....

اور ’تبدیلی‘ کا نعرہ لگا کر اقتدار حاصل کرنے والے عمران خان! ہمیں گڈ گورننس کا خواب دکھانے والے عمران خان؟.... عمران خان صاحب! یہ ہے وہ ’’تبدیلی‘‘ جس کے خواب آپ نے ہمیں دکھائے تھے۔ یہ ہیں وہ ہیرے Electables جو آپ نے دوسری سیاسی جماعتوں سے چرائے ہیں؟ اس ملک میں ہے کوئی جو اس اندھیر نگری اور چوپٹ راج کو مانیٹر کرے؟

اور اساتذہ.... اس ملک کے لاکھوں اساتذہ اور بیسیوں وائس چانسلرز۔ کسی میں حمیت نہیں کہ اس پر احتجاج کریں، ہڑتال کریں۔

ہم پھر کہتے ہیں کہ یہ گلا سڑا معاشرہ انسانوں کے رہنے کے قابل نہیں۔ پورا نظام لعنتی ہے۔ ایک معزز استاد، ایک عالم دین، ایک پروفیسر چھ مہینے سے جرم بے گناہی میں جیل میں سڑ رہا ہے اور کسی کے کان پر جوں نہیں رینگتی۔ تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

تعلیم و تربیت / ڈائیلاگ

مولانا زاہد الراشدی
ڈاکٹر محمد امین

تعلیمی ثنویت کا ذمہ دار کون؟
حکمران یا علماء کرام!

مولانا زاہد الراشدی کا موقف: تعلیمی ثنویت کے ذمہ دار حکمران ہیں

آج دینی مدارس اور کالجوں کے نصاب و نظام کو یکساں بنانے کی بات کی جا رہی ہے اور تقاضا کیا جا رہا ہے کہ دینی و عصری تعلیم کو یک جا کر کے ایک ہی نصاب و نظام ملک میں رائج کیا جائے، یہ ایک اچھی بات ہے مگر اس سے قبل اس بات کا جائزہ لینا ضروری ہے کہ دونوں تعلیمی نصاب الگ کیوں ہوئے تھے اور ان کو اکٹھا کرنے میں رکاوٹ کون ہے؟ میں اس سوال کو چار حصوں میں تقسیم کروں گا:

۱۔ ان دونوں تعلیمی نصابوں کو الگ الگ کس نے کیا تھا؟

۲۔ سب سے پہلے اس تقسیم کے خلاف آواز کس نے بلند کی تھی؟

۳۔ اسے ختم کرنا کس کی ذمہ داری تھی؟ اور

۴۔ آج اس کو ختم کرنے میں کون رکاوٹ ہے؟

یہ بات درست ہے اور ایک زندہ حقیقت کے طور پر ہمارے سامنے موجود ہے کہ آج دینی مدارس میں پڑھایا جانے والا نصابِ تعلیم کالجوں اور سکولوں کے نصاب سے مختلف ہے۔ سکول و کالج میں جو کچھ پڑھایا جاتا ہے وہ مدرسہ میں نہیں پڑھایا جاتا اور مدرسہ میں جن مضامین کی تعلیم ہوتی ہے ان کی سکول و کالج میں تعلیم نہیں ہوتی مگر یہ ہمیشہ سے نہیں ہے۔ پہلے یہ دونوں اکٹھے تھے جنہیں تقسیم کر دیا گیا۔ آیئے ایک نظر دیکھ لیں کہ یہ تقسیم کب ہوئی اور کس نے کی؟

دینی مدارس میں جو نصاب پڑھایا جاتا ہے اسے درس نظامی کہا جاتا ہے اور یہ اورنگزیب عالمگیرؒ کے دور میں ملا نظام الدین سہالوی رحمہ اللہ تعالیٰ نے ترتیب دیا تھا۔ سہال لکھنو کے

علاقہ میں ایک جگہ کا نام ہے جہاں ملا قطب الدینؒ کا علمی و دینی خاندان آباد تھا اور وہ تعلیمی و دینی سرگرمیوں میں مصروف رہتے تھے۔ ایک گروہ کے ساتھ ان کا جھگڑا ہو گیا جو طاقت ور تھا اور انہوں نے ملا قطب الدینؒ کو شہید کر کے ان کے خاندان کو علاقہ سے نکال دیا اور ان کے مکانات جلا کر زمینوں پر قبضہ کر لیا۔

ملا قطب الدین شہیدؒ کے بیٹے ملا نظام الدین اپنے خاندان کو لے کر لکھنو شہر میں آ گئے اور اس وقت کے بادشاہ سلطان اورنگزیب عالمگیر رحمہ اللہ تعالیٰ نے انہیں ایک یورپی تاجر کی خالی کردہ غیر آباد کوٹھی ''فرنگی محل'' عطا کر دی کہ وہ اس میں ٹھکانہ کریں اور اپنا تعلیمی ادارہ چلائیں۔ انہوں نے وہاں پناہ لی اور تعلیمی نظام قائم کیا۔ انہوں نے اپنے پہلے سے چلے آنے والے نصاب تعلیم کو از سر نو مرتب کیا جو ان کے نام سے موسوم ہو کر ''درس نظامی'' کہلایا اور پچھلی ڈیڑھ صدی سے اس خطہ کے اکثر مدارس میں یہی نصاب پڑھایا جا رہا ہے۔ اس نصاب میں قرآن و حدیث، فقہ و شریعت اور فارسی و عربی زبان کے وہ تمام مضامین شامل تھے جو آج دینی مدارس میں پڑھائے جاتے ہیں اور ان کے ساتھ حساب، ہندسہ، ہیئت، طب، تاریخ، جغرافیہ، وضع آلات، فلکیات، فلسفہ، منطق اور دیگر علوم بھی شامل نصاب تھے جو آج انجینئرنگ، ریاضی، میڈیکل، سائنس اور دیگر عنوانات کے ساتھ عصری علوم کہلاتے ہیں اور سکول و کالج کے نصاب کا حصہ ہیں۔ یہ دونوں علوم ایک ہی چھت کے نیچے، ایک چار دیواری کے اندر، ایک تپائی اور انہی اساتذہ کے ذریعہ پڑھائے جاتے تھے جو قرآن و حدیث جیسے دینی علوم کی تعلیم دیتے تھے۔

یہ سلسلہ ۱۸۵۷ء تک جاری رہا اور جب ۱۸۵۷ء کی جنگ آزادی میں ہماری پسپائی کے بعد انگریزوں نے براہِ راست اقتدار پر قبضہ کر لیا اور سارا نظام ختم کر کے نیا نظام رائج کیا تو نئے تعلیمی نصاب سے عربی، فارسی، قرآن کریم، حدیث، فقہ اور دیگر اسلامی مضامین کو خارج کر دیا اور ان علوم کو معاشرے میں باقی رکھنے کے لیے ہمارے بزرگوں نے تعلیم کا یہ پرائیویٹ نظام تشکیل دیا جو آج ہزاروں دینی مدارس کی صورت میں کام کر رہا ہے۔

اس لیے پہلی بات یہ سمجھنے کی ہے کہ دینی و عصری علوم کی یہ تقسیم ہم نے نہیں کی بلکہ یہ ہم پر مسلط کی گئی ہے اور بلا وجہ ہمارے کھاتے میں ڈال دی گئی ہے، بات صرف اتنی ہے کہ ہمارے

بزرگوں نے صحیح طور پر یہ سوچا کہ اگر قرآن وحدیث، فقہ وشریعت اور عربی علوم کی تعلیم کا سلسلہ بالکل منقطع ہو گیا تو دوسری تیسری نسل میں یہ باقی نہیں رہیں گے۔ اس لیے ان علوم کی تعلیم و تدریس کو باقی رکھنے کے لیے دینی مدارس قائم کیے گئے جو کسی قسم کی سرکاری امداد یا مداخلت کو قبول کیے بغیر آزادانہ طور پر گزشتہ ڈیڑھ صدی سے ان علوم کی تعلیم کو جاری رکھے ہوئے ہیں اور کم وبیش ایک صدی تک ان مدارس کا مجموعی ماحول یہ رہا ہے کہ مسجد کی چٹائیوں پر بیٹھ کر اور محلہ سے مانگ کر لائی جانے والی روٹیاں کھا کر ہزاروں علماء وطلبہ نے اس نظام کو چلایا ہے۔

یہ بلڈنگیں اور سہولتیں تو اب نصف پون صدی سے مل رہی ہیں، اس سے قبل چند بڑے مدارس کو چھوڑ کر تمام دینی مدرسہ مسجد کی صفوں اور محلہ کی روٹیوں پر ہی قائم تھا۔ میں نے اپنے بچپن میں یہ ماحول دیکھا ہے بلکہ خود بھی کئی سال تک محلہ کی روٹیاں مانگی ہیں، چنانچہ پہلی بات یہ عرض کروں گا کہ یہ تقسیم ہم نے نہیں کی بلکہ ہم پر مسلط کی گئی ہے۔ جب تک تعلیمی نظام ہمارے ہاتھ میں تھا ہم دونوں شعبوں کے علوم اکٹھے پڑھاتے تھے اور جب دینی علوم کو ریاستی نظام سے نکال دیا گیا تو نصاب سے فارغ کیے جانے والے علوم کو معاشرہ میں باقی رکھنے کے لیے ہم متحرک ہوئے اور بحمداللہ تعالیٰ اس میں سرخرو رہے۔ یہ محض پروپیگنڈے کا کرشمہ ہے کہ دینی علوم اور عصری علوم میں تقسیم کو ہمارے کھاتے میں ڈالا جا رہا ہے اور ہمارے ساتھ اس کہاوت والا معاملہ ہو رہا ہے کہ کسی جنگل کے کنارے پر ایک زمیندار کا ڈیرہ تھا، وہ رات کو جو دودھ ایک بڑے برتن میں سنبھالتے اسے جنگل سے کوئی بندر آ کر پی جاتا اور تھوڑا سا دودھ قریب بندھے ہوئے کٹّے کے منہ پر مل دیتا جس پر اس غریب کی روزانہ پٹائی ہوتی کہ رات کو سارا دودھ یہ پی گیا ہے۔ ایک روز زمیندار نے خود یہ منظر دیکھ لیا کہ آدھی رات کے بعد بندر جنگل سے اترا اور دودھ پینے کے بعد ملائی کٹے کے منہ پر مل کر جنگل میں غائب ہو گیا۔ اس کے بعد اس کٹّے کی جان چھوٹی مگر ہماری جان اب تک نہیں چھوٹ رہی۔ تعلیمی نظام ونصاب کو تقسیم کرنے والا بندر اپنا کام کر کے کب کا جا چکا ہے جبکہ ہماری اب بھی پٹائی جاری ہے اور ہمیں اس تقسیم کا ذمہ دار ٹھہرا کر کردار کشی کا سلسلہ بدستور چل رہا ہے۔

دوسرا سوال یہ ہے کہ دینی وعصری علوم کی اس تقسیم کے نقصانات کا اندازہ کر کے اس کو ختم کرنے کی بات سب سے پہلے کس نے کی ہے؟ تو اس کیلیے میں آپ کو ایک صدی پیچھے لے جانا

چاہوں گا جب دار العلوم دیوبند کے حلقہ کے سربراہ شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ نے تحریک آزادی میں مالٹا کی اسارت کے بعد واپس آ کر دونوں تعلیموں کو اکٹھا کرنے کی بات کی اور خود علی گڑھ جا کر اس کی آواز لگائی جس کے نتیجے میں نہ صرف مسلم نیشنل یونیورسٹی قائم ہوئی جو پھر جامعہ ملیہ کے نام سے کام کرتی آ رہی ہے بلکہ دیوبند اور علی گڑھ کے تعلیم یافتہ حضرات پر مشتمل قومی لیڈر شپ سامنے آئی جس میں مولانا محمد علی جوہرؒ، مولانا سید حسین احمد مدنیؒ، مولانا شوکت علیؒ، مولانا ظفر علی خانؒ، حکیم محمد اجمل خانؒ، مولانا عبید اللہ سندھیؒ، مولانا ابوالکلام آزادؒ، مولانا شبیر احمد عثمانیؒ اور مفتی کفایت دہلویؒ جیسی عظیم شخصیات شامل ہیں۔

اس کے ساتھ مولانا سید حسین احمد مدنیؒ کا تیار کردہ وہ اٹھارہ سالہ تعلیمی نصاب بھی تاریخ کا حصہ ہے جس کو انہوں نے آسام میں یونیورسٹی قائم کرنے کیلیے ترتیب دیا تھا اور جس میں دینی مدارس اور سکولوں کالجوں میں پڑھائے جانے والے الگ الگ تعلیمی نصابوں کو یکجا کر کے مشترکہ تعلیمی نصاب قوم کے سامنے رکھا تھا مگر انہیں حالات کے تقاضے پر آسام چھوڑ کر دیوبند آنا پڑا اور پھر وہ یونیورسٹی وجود میں نہ آسکی جس کے لیے انہوں نے وہ نصاب تیار کیا تھا، البتہ وہ نصاب شائع شدہ صورت میں آج بھی موجود و محفوظ ہے، چنانچہ یہ بھی تاریخی حقیقت ہے کہ دینی و عصری علوم کی تقسیم کے معاشرتی نقصانات کو دیکھ کر اسے ختم کرنے اور مشترکہ تعلیمی نصاب و نظام رائج کرنے کی تحریک بھی علماء کرام کی طرف سے ہی سامنے آئی۔

تیسرا سوال یہ ہے کہ اس تقسیم کو ختم کرنے کی ذمہ داری کس پر تھی؟ ظاہر بات ہے کہ انگریزوں نے تو خود یہ تقسیم کی تھی اور ان کے دور میں اسے ختم کرنے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا تھا، البتہ جب ملک آزاد ہوا اور پاکستان کے نام سے مسلمانوں کی الگ ریاست قائم ہوگئی تو یہ ذمہ داری پاکستان کے ریاستی نظام تعلیم کی تھی کہ وہ اس تقسیم کو ختم کر کے دونوں نصابوں کو اکٹھا کرتا اور مشترکہ نصاب تعلیم کا اہتمام کرتا اور یہ اس حوالہ سے بھی اس کی ذمہ داری تھی کہ پاکستان اسلام کے نام پر اور اسلامی احکام و قوانین کی عملداری کے نام سے وجود میں آیا تھا اور اس ملک میں اسلامی احکام و قوانین کے نفاذ اور اسلامی تہذیب و ثقافت کے تحفظ و فروغ کے لیے انتظام اور عدالتی ماحول فراہم کرنا اور افسران اور ججوں کو قرآن و سنت کی تعلیم دینا ریاستی نظام تعلیم کے ذمہ تھا مگر ستر سال گزر جانے کے باوجود ریاستی نظام تعلیم اس ذمہ داری کو قبول

کرنے کیلیے تیار نہیں ہے اور عجیب سی صورت حال ہے کہ ملک کا دستور کہتا ہے کہ قرآن وسنت کے احکام وقوانین کو ملک میں نافذ کرنا اور اسلامی معاشرتی ماحول قائم کرنا ریاست کی ذمہ داری ہے مگر حکومتی سطح پر عدلیہ اور انتظامیہ کے کسی شعبہ میں قرآن وسنت کی تعلیم کا کوئی ماحول اور انتظام موجود نہیں ہے حتیٰ کہ قرآن کریم کی صرف ناظرہ تعلیم کی ذمہ داری قبول کرنے سے بھی ہمارا ریاستی نظام تعلیم اب تک گریزاں ہے جبکہ یہی بات پاکستان میں اسلامی احکام کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ ہے۔

ملک میں قانونی نظام اور انتظامی ماحول کو قیام پاکستان کے مقاصد کے مطابق ڈھالنے کے لیے جہاں سول سروس کے افسران اور ملازمین کو قرآن وسنت اور فقہ وعربی کی تعلیم دینا ضروری ہے وہاں عدلیہ میں اسلام کے مطابق فیصلے کرنے کے لیے قانونی تعلیم کے نصاب میں اسلام کے عدالتی نصاب کو شامل کرنا بھی اس کا ناگزیر تقاضہ ہے، مگر ریاست کی تعلیم کا حال یہ ہے کہ وفاقی محتسب اعلیٰ کے واضح حکم اور منتخب اسمبلیوں کے فیصلوں کے باوجود ابھی تک دینی تعلیم کا بالکل ابتدائی لیول یعنی ناظرہ قرآن کریم نصاب میں شامل نہیں کیا جارہا۔

چوتھا سوال اس حوالہ سے یہ ہے کہ اب اس میں کون رکاوٹ ہے؟ تو آج کے زمینی حقائق یہ ہیں کہ مدارس تو میٹرک تک کی ضروری عصری تعلیم کو اپنے نظام ونصاب کا حصہ بنا چکے ہیں مگر ریاستی تعلیم دینی علوم کو نصاب کا حصہ نہیں بنا رہی مگر نصاب کو یکساں کرنے کا سارا زور دینی مدارس پر ہے جس کا مطلب یہ ہے کہ قرآن وحدیث، فقہ اسلامی اور عربی زبان کی تعلیم دینے کیلیے دینی مدارس کو اس نظام کا حصہ بننے پر مجبور کیا جارہا ہے جس میں ان میں سے کوئی مضمون نصاب کا باضابطہ حصہ نہیں ہے، اس کا نتیجہ اس کے سوا کیا ہوسکتا ہے کہ جن دینی علوم ومضامین کی تعلیم دینی مدارس نے باقی رکھی ہوئی ہے وہ بھی نصاب سے خارج ہوجائیں اور وہ ایجنڈا مکمل ہوجائے جسے برطانوی حکومت نے ۱۸۵۷ء کے بعد تعلیمی حوالہ سے نافذ کیا تھا گویا وہ تعلیمی ایجنڈا برطانوی حکومت اپنے دور میں پورا نہیں کرسکی تھی اسے اب ایک اسلامی ریاست میں مسلمان حکومت کے ذریعہ مکمل کرالیا جائے۔

ہمارے یہ مہربان سکول وکالج اور دینی مدارس کے نصاب کو یکساں بنانے کیلیے جو کچھ کہہ رہے تھے وہی عملاً کررہے ہیں اسے دیکھ کر مجھے وہ لطیفہ یاد آرہا ہے کہ ایک ریسٹورنٹ کے مین

گیٹ پر تختی لگی ہوئی تھی کہ یہاں گھوڑے اور خرگوش کا گوشت مکس پکایا جاتا ہے اور شوقین لوگ وہاں آکر یہ شوق پورا کرلیا کرتے تھے، ایک دن کسی گاھک نے کاؤنٹر پر پوچھ لیا کہ گھوڑے اور خرگوش کا گوشت کس حساب سے مکس کیا جاتا ہے؟ تو جواب ملا کہ بالکل برابر ہوتا ہے کہ ہم ایک گھوڑے اور ایک خرگوشت کا گوشت ملا کر پکاتے ہیں۔

اور اب موجودہ حکومت کی طرف سے دونوں نصابوں کو یکساں کرنے کی مہم میں یہ بات ایک نئی سامنے آئی ہے کہ وفاقی وزیر تعلیم کو یہ اعتراف کرنا پڑا کہ پرائیویٹ سکولوں کا وسیع تر نیٹ ورک یعنی وہ تعلیمی نظام جو اولیول۔ اے لیول کے ٹائٹل کے ساتھ مغربی نظام تعلیم کو یہاں فروغ دینے میں مصروف ہے وہ تعلیمی نصاب میں یکسانیت قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہے، یعنی قرآن و حدیث، فقہ اسلامی اور عربی زبان کی تعلیم کو اپنے نصاب و نظام میں شامل کرنے سے انکاری ہے۔

ان حقائق کی بنیاد پر میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ دینی وعصری علوم کی تقسیم نہ ہم نے کی ہے اور نہ ہی ہم اس کو باقی رکھنا چاہتے ہیں بلکہ ہم دینی علوم کو صحیح مقام دینے کی صورت میں اسے یکجا کرنے کے حق میں ہیں، ہمیں خوہ مخواہ مورد الزام ٹھہرانے کی بجائے اصل عوامل کو تلاش کیا جائے اور انہیں دور کرنے کی کوشش کی جائے۔ (ماہنامہ نصرۃ العلوم گوجرانوالہ)

مدیر البرہان کا مؤقف

تعلیمی ثنویت کے ذمہ دار حکمران اور علماء دونوں ہیں

مولانا زاہد الراشدی صاحب ہمارے صاحبِ علم دوست ہیں۔ ملی مجلس شرعی میں وہ ہمارے رفیقِ کار بھی ہیں۔ ہمارے درمیان اشتراک فکر کے دائرے کافی وسیع ہیں تاہم اختلاف کی لہریں بھی اٹھتی رہتی ہیں اور ہلکی پھلکی علمی نوک جھونک بھی چلتی رہتی ہے، جس کا نہ ہی وہ برا مناتے ہیں اور نہ ہی مَیں منہ پھلاتا ہوں کہ ہم گوشت پوست کے سوچنے سمجھنے والے انسان ہیں۔ سو فیصد ہم آہنگی تو بے جان مشینوں کے سانچوں ہی میں ممکن ہوتی ہے۔

تعلیمی ثنویت کے اسباب کے حوالے سے مولانا نے سطور بالا میں جو کچھ لکھا ہے وہ ہمیں

خاصہ یک طرفہ اور جانب دارانہ لگا۔ مولانا کہتے ہیں کہ تعلیمی ثنویت کے ذمہ دار صرف حکمران ہیں اس میں دینی مدارس اور ان کے چلانے والے علماء کرام کا کوئی قصور نہیں اور یہ ثنویت ان پر مسلط کی گئی ہے جبکہ ہماری رائے میں حکمرانوں کے ساتھ علماء کرام بھی اس کے ذمہ دار ہیں۔ ہمارے دلائل مندرجہ ذیل ہیں۔

یہ بات صحیح ہے کہ اوقاف کا نظام ختم کر کے اور انگریزی کو ذریعۂ تعلیم بنا کر مسلمانوں کے نظام تعلیم کو منہدم کرنے والے انگریز تھے۔ اور یہ بھی صحیح ہے کہ انگریز کی کافر حکومت کو افرادی قوت مہیا کرنا علماء کرام کے پیش نظر نہ تھا اور یہ بھی صحیح ہے کہ علماء کے پاس اس وقت مادی وسائل کی شدید قلت تھی۔ اس لیے اگر انھوں نے اس وقت کے دنیاوی اور عصری مضامین پڑھانے سے ابتداءً اعتنا نہ کیا تو اس کا جواز موجود تھا۔ لیکن اس کے ساتھ دو اور حقائق کو بھی نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

ایک یہ کہ مسلمانوں کا نظام تعلیم صدر اوّل ہی سے علماء کرام کے ہاتھ میں تھا اور وہ موحد تھا (یعنی اس میں دینی و دنیاوی علوم الگ الگ نہ تھے، یکجا تھے) اور وہ حکومتوں کی چھتری تلے بھی نہ تھا بلکہ بارہ تیرہ سو سال تک علماء کرام کے آزادانہ تصرف میں تھا۔ دوسرے یہ کہ اس پس منظر کے ساتھ علماء کرام کے ذہن میں یہ بات موجود تھی کہ دنیاوی علوم سے مسلمان طلبہ کا ناطہ قطع کرنا دینی اور دنیاوی لحاظ سے مضر تھا۔ چنانچہ دیوبند قائم کرنے والوں کے رہنما حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ کے الفاظ معروف ہیں کہ یونانی منطق اور فلسفہ پڑھنے سے تو انگریزی سیکھنا بہتر ہے کہ طلبہ کی دنیا کے کام آئے گی۔ چنانچہ جب یہ احساس قوی ہو گیا تو مولانا محمود حسنؒ کے دور میں علی گڑھ اور دیوبند میں ایک معاہدہ ہوا جس کی رو سے علی گڑھ کے طلبہ دو سال کے لیے دیوبند آ کر دین سیکھتے اور دیوبند کے طلبہ دو سال کے لیے علی گڑھ جا کر دنیاوی اور عصری علوم سیکھتے لیکن بوجوہ یہ بیل منڈھے نہ چڑھ سکی (تفصیل کا یہ موقع نہیں)۔

اسی جذبے سے علامہ شبلی اور مولانا محمد علی مونگیری نے ندوۃ العلماء بنایا لیکن وہ قدیم وجدید کو جمع نہ کر سکا۔ اسی غرض سے مولانا محمود حسن نے مسلم قومی رہنماؤں سے مل کر جامعہ ملیہ کا آغاز کیا لیکن وہ بھی قوم پرستوں کے ہتھے چڑھ گئی اور قدیم وجدید کو جمع نہ کر سکی تقسیم ہندوستان کے بعد وہ ایک عام سرکاری یونیورسٹی بن کر رہ گئی۔

۲۔ تقسیم ہندوستان تک یہ صورتِ حال چلتی رہی۔ پاکستان بن جانے کے بعد مسلم حکمرانوں کا فرض تھا کہ وہ زندگی کے سارے شعبوں اور خصوصاً نظام تعلیم کی اسلامی تشکیل نو کرتے اور تعلیمی ثنویت کا خاتمہ کرتے لیکن حکمرانوں نے یہ کام نہ کیا اور نہ اس کی ضرورت واہمیت کو سمجھا۔ یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ علماء کرام نے تعلیمی ثنویت کے خاتمے کی کوشش کیوں نہ کی جب کہ وہ یہ سمجھ سکتے تھے کہ:

- اب ملک پر انگریزوں کی حکومت نہ تھی اور ریاست بہرحال مسلمانوں کی تھی۔

- اب مدارس کے پاس یہ عذر نہ تھا کہ وہ صرف مسجد اور مدرسے کے لیے آدمی تیار کریں گے اور ریاست کے لیے کارکن تیار نہ کریں گے۔

- علماء کرام بارہ سو سال تک وہ تعلیمی نظام چلاتے رہے جس میں دین ودنیا دونوں کے علوم موجود تھے۔ لہٰذا انہیں اپنی اصل کی طرف لوٹ جانے میں کوئی رکاوٹ نہ تھی۔

- مسلمانوں کے مالی حالات بھی اب انگریز استعمار کے زمانے جتنے برے نہ تھے کہ وہ وقتی طور اختیار کیے گئے تعلیمی نظام سے واپس نہ لوٹ سکتے لیکن علماء کرام نے اپنے مدارس میں دینی ودنیاوی علوم جمع کرنے کا کام نہ کیا جس کے خوفناک نتائج نکلے مثلاً:

- اس سے دین ودنیا میں تفریق کا تاثر پختہ ہو گیا جو سیکولرزم کی بنیادوں کو مستحکم کرنے کا سبب بنا۔

- اس سے معاشرے میں مسٹر اور ملّا اور مذہبی وغیر مذہبی شخصیت کی تفریق گہری ہوتی چلی گئی جس نے معاشرتی ہم آہنگی کو نقصان پہنچایا۔

- معاشرہ اور ریاست چلانے کا نظام جدید تعلیم یافتہ لوگوں کے پاس چلا گیا جنہوں نے نہ اسلامی تعلیم پائی تھی اور نہ اسلامی تربیت۔ (اس کے ذمہ دار حکمران تھے تو علماء بھی تھے جنہوں نے اس ضمن میں جدوجہد کو اپنی ذمہ داری نہ سمجھا) چنانچہ انہوں نے ملک میں شریعت نافذ کرنے اور اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے کی بجائے مغربی فکر وتہذیب کے تصورات (جیسے سیکولرزم، لبرل ازم، کیپٹل ازم وغیرہ) اور اداروں (جیسے مغربی جمہوریت، سود پر مبنی بنکنگ اور فحاشی وعریانی کو فروغ دینے والے میڈیا) کو اپنانے کا رویہ اختیار کیا۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۴۰)

فہم اسلام

محدث کبیر شیخ ناصر الدین الالبانیؒ
اُردو ترجمانی: مدیر

مسلم معاشرے میں تبدیلی کیسے آسکتی ہے؟

مَیں یہ بات کئی دہائیوں سے کہہ رہا ہوں کہ مسلم معاشرے میں تبدیلی قوت کے استعمال سے (بذریعہ انقلاب وخروج) نہیں آسکتی بلکہ صرف تصفیہ وتربیت سے آسکتی ہے۔ جنہیں ہمارے اس منہج سے اختلاف ہے وہ ازراہ کرم ہمیں بتائیں کہ وہ تبدیلی کیسے لائیں گے جب کہ

- مسلمانوں کی اکثریت اسلام سے نابلد ہے
- کچھ جو سمجھتے ہیں ان کی اکثریت اس پر عمل نہیں کرتی۔ نہ اسلام نے ان کے دلوں میں گھر کیا ہے اور نہ ان کے گھروں میں اسلام موجود ہے۔

جبکہ ہم سب کا اعتقاد یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کے لیے اللہ کی نصرت کی ایک ہی شرط ہے جو قرآن نے یوں بیان کی ہے [ï YNZ nÕ'YNZ¦AÜ یعنی تم اللہ کی نصرت کرو وہ تمہاری نصرت کرے گا۔ ہم اللہ کی نصرت کیسے کر سکتے ہیں؟ صحیح علم سے اور عمل صالح سے۔ اور جیسا کہ آپ جانتے ہیں کہ آج علم میں بہت انحراف واقع ہو چکا ہے اور وہ سلف صالح کے علم سے مختلف ہو گیا ہے۔ [آج کل علم صرف دنیا کمانے کے لیے رہ گیا ہے] حالانکہ نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا تھا: I3/ [ÓÕ D,E/D3ýÉØ#LB" j }Xu D3Z ¦ÓÕ DZS . Ü وَتَرَكْتُمُ الْجِهَادَ ، سَلَّطَ اللهُ عَلَيْكُمْ ذُلًّا لَا يَنْزِعُهُ حَتّٰى تَرْجِعُوا إِلٰى دِينِكُمْ[1]

یعنی جب تم جہاد چھوڑ بیٹھو اور تجارت وزراعت ہی میں گم ہو کر رہ جاؤ تو اللہ تعالیٰ تم پر ذلت مسلط کر دے گا اور وہ اس وقت تک دور نہیں کرے گا جب تک تم (صحیح) دین کی طرف نہ پلٹ آؤ۔ لیکن آج تو دین کا مفہوم ہی بدل گیا ہے۔ فروع میں ہی نہیں اصولوں میں بھی، احکام میں ہی نہیں عقائد میں بھی۔ کیا اسلام کی نصرت اشاعرہ وماتریدیہ کے عقائد کے جھگڑوں میں ہے؟ لہٰذا تصفیہ وتربیہ یعنی صحیح علم اور عمل صالح کی طرف رجوع کیے بغیر چارہ نہیں جیسا کہ نبی

[1] ابوداؤد، رقم الحدیث: ۳۴۶۲

کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے فرمایا: ˝± p̃Y}ĳĭ̆"Ű'Ě ,Ũż ĺij

پس ضروری ہے کہ ہم پہلے اسلام کا صحیح مفہوم لوگوں کو بتائیں، پھر اس کے مطابق ان کی تربیت کریں۔ اگر ہم نے ایسا کرلیا تو یقیناً اس کا نتیجہ اللہ کی نصرت کی صورت میں نکلے گا جس کا اس نے ہم سے وعدہ کیا ہے ZnYpp YzȤt ZqZZ lAnbyPnØ* Ys XgymD [الروم ۳۰: ۴۷] لیکن اگر ہم نے یہ منہج اختیار نہ کیا۔ نہ لوگوں تک صحیح اسلام پہنچایا اور نہ اس کے مطابق ان کی تربیت کی تو ہمیں اللہ کی نصرت ہرگز حاصل نہ ہوگی اور نہ ہم مسلمانوں کی عظمت گم گشتہ کی طرف لوٹ سکیں گے۔

بقیہ: تعلیمی ثنویت کا ذمہ دار کون؟

- دینی مدارس کے فارغ التحصیل طلبہ وعلماء میں مغربی فکر وتہذیب کو سمجھنے اور اسے علمی بنیادوں پر رد کرنے کی صلاحیت پیدا نہ ہوسکی۔

- دینی مدارس کے فضلاء نے دین کا مطالعہ اس طرح کیا جس سے اسلام کی عصری معنویت واہمیت ان پر واضح نہ ہوسکی اور جدید تہذیب کے پیدا کردہ مسائل میں لوگوں کی رہنمائی کی صلاحیت ان میں پیدا نہ ہوسکی۔

۳۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ علماء اگر تعلیمی ثنویت ختم کرنا چاہتے تو کون ان کا ہاتھ پکڑ رہا تھا؟ اگر وہ حکومتوں کی سرپرستی کے بغیر دینی مدارس کا نظام چلا سکتے ہیں تو دینی ودنیاوی علوم کو جمع کرکے ان کا نظام کیوں نہیں چلا سکتے؟ یقیناً چلا سکتے ہیں۔ اصل بات یہ ہے کہ انہیں اس کی ضرورت واہمیت کا ادراک واحساس نہیں۔ وہ بس مکھی پر مکھی مارتے چلے جا رہے ہیں اور ڈیڑھ صدی پیشتر ان کے اجداد نے جو نظام تعلیم وضع کیا تھا اس پر نظر ثانی کی ہمت وہ اپنے اندر نہیں پاتے۔

لہٰذا ہمارا موقف یہ ہے کہ علماء کرام اگر چاہیں تو آج بھی تعلیمی ثنویت ختم کرسکتے ہیں اور اس کے جو مطالبات ہیں انہیں پورا کرسکتے ہیں لیکن انہیں اس کی ضرورت واہمیت کا احساس نہیں ہے۔ اگر ہوتا تو وہ آج بھی تعلیمی ثنویت ختم کرسکتے ہیں اور دین ودنیا دونوں کی تعلیم اپنے مدارس میں دے سکتے ہیں۔

پاکستان اور اسلام

ڈاکٹر محمد امین

بہاولپور میں شاگرد کے ہاتھوں استاد کا قتل

اسلام میں انتہا پسندی کا مفہوم

اگر ایک شخص اسلامی تعلیمات پر عمل کرنے پر اصرار کرے تو یہ انتہا پسندی ہے؟
اور اگر کوئی شخص اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنے پر اصرار کرے تو کیا یہ انتہا پسندی نہیں؟

❁ بہاولپور کے ایک کالج میں ایک 'دین دار' شاگرد کے ہاتھوں انگریزی زبان کا ایک استاد قتل ہو گیا۔ شاگرد کی بدبختی میں کوئی شک ہی نہیں جس نے استاد کو قتل کر دیا اور استاد کی بے عقلی میں بھی کوئی شک نہیں جس نے ایک غیر اسلامی رویے پر اصرار کر کے اپنے بیٹوں کی عمر کے ایک شاگرد کو اتنا مشتعل کر دیا کہ وہ اس کی جان لینے پر تل گیا۔

❁ ہمارے نزدیک دونوں انتہا پسند تھے اور دونوں قابل مذمت ہیں۔ یہ دہرا معیار کب تک چلے گا کہ اگر ایک شخص دینی تعلیمات پر عمل کرنے پر اصرار کرے تو وہ انتہا پسند ہے اور دوسرا شخص اگر اسلامی تعلیمات پر عمل نہ کرنے پر اصرار کرے تو وہ انتہا پسند نہیں۔ جھگڑے کی جو وجہ سامنے آئی ہے وہ یہ ہے کہ استاد ایک مخلوط پارٹی کرنے پر مصر تھا اور طالب علم اسے غیر اسلامی قرار دے کر نہ کرنے پر اصرار کر رہا تھا۔ بحث و مناقشہ کی تلخی نے یہ رخ اختیار کیا کہ طالب علم نے مشتعل ہو کر استاد کو قتل کر دیا۔ ہمارے نزدیک دونوں قصوروار ہیں۔

❁ جن لوگوں نے اسے فرقہ واریت کا رنگ دینے کی کوشش کی، وہ عصبیت جاہلیہ کا شکار ہوئے جس کی نبی کریم صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم نے مذمت فرمائی ہے۔ شاگرد کا خطا کار اور متشدد ہونا واضح ہے اور قابل مذمت ہے۔ استاد اگر غلط تھا تو بھی اسے استاد پر ہاتھ اٹھانے اور اس کی جان لینے کا کوئی حق نہیں تھا۔ لیکن دیکھنے کی بات یہ ہے کہ زیر بحث معاملے میں حق کس کے ساتھ تھا؟ ظاہر ہے شاگرد حق پر تھا کیونکہ مخلوط اجتماعات کا غیر شرعی ہونا واضح ہے کہ قرآن وسنت نے غضِ بصر کا حکم دیا ہے اور اختلاط سے منع کیا ہے۔ سوال یہ ہے کہ حکومت کے مخلوط تعلیم کو رواج دینے سے اور پاکستانی معاشرے، علماء اور دینی عناصر کے اسے قبول کر لینے سے کیا شرعاً ایک حرام کام حلال ہو جاتا ہے؟ یا اس کا معصیت ہونا ختم ہو جاتا ہے؟ یہ کہاں کا دین ہے؟ (بقیہ صفحہ نمبر: ۴۷)

تفہیم مغرب

ڈاکٹر جاوید اکبر انصاری[1]

نظامِ سرمایہ داری اور عقیدۂ آزادی

نظامِ زندگی اس ساختی تشکیل کو کہتے ہیں جو ایک خاص تصورحیات انفرادیت، معاشرت اور ریاست پر نافذ کرتی ہے۔ اس نظام کے ذریعے ایک مخصوص روحانیت فروغ پاتی ہے جو اس نظام کے عقائد ونظریات کی غماز ہوتی ہے۔ اسلام اور سرمایہ داری انہی معنوں میں دوجداگانہ نظام زندگی اور طرز حیات ہیں کہ وہ مخصوص انفرادیت، معاشرت اور ریاست کو فروغ دیتی ہیں۔ ان مخصوص اور منفرد انفرادیتوں، معاشرتوں اور ریاستوں کی تعمیراتی بنیادیں وہ مخصوص عقائد فراہم کرتے ہیں جو وہ نظام لازماً مفروض کرتا ہے یعنی جو لازماً ماورائی اور مابعد الطبیعیاتی ہوتے ہیں اور جن تک عقل کی رسائی نہیں ہوتی۔ سرمایہ داری کے بنیادی مفروضات/عقاید انسان کی آزادی، مساوات اور ترقی ہیں جو شخص بھی آزادی، مساوات اور ترقی پر ایمان لے آئے وہ ایک مفلوک الحال مزدور یا ایک بے کس ہاری ہی کیوں نہ ہو، وہ اس نظام کا پیرو ہوگا۔ سرمایہ داری ان مابعد الطبیعیاتی مفروضات، آزادی، مساوات اور ترقی کی جو تشریح پیش کرتی ہے وہ پچھلے سو سال میں اس کے نظاماتی غلبہ کا باعث رہی ہے۔

آزادی کے لغوی معنی وہ صلاحیت ہے جو کسی عمل انسانی کے کرنے کے لیے ضروری ہے اور ان رکاوٹوں کی عدم موجودگی جو اس عمل کے کرنے کو ناممکن بناتی ہوں۔ جانور حرکت کرنے کے لیے آزاد لیکن بامعنی مواصلات کرنے سے معذور ہیں۔ آزادی ایک صلاحیت ہے جیسے کہ سانس لینے کی صلاحیت۔ اگر انسان کو آزادی کی صلاحیت ودیعت نہ کی گئی ہوتی تو وہ خیر وشر میں تمیز کرنے سے قاصر رہتا لیکن نہ تو سانس لینے کی صلاحیت اور نہ ہی آزادی کی صلاحیت میں مستقل اضافہ ایک مسلمان کا مقصدِ حیات ہوسکتا ہے۔ ایک مسلمان آزادی پر ایمان نہیں لاتا اور آزادی کے مستقل اضافہ کو اپنے مقصدِ حیات کے طور پر قبول نہیں کرتا۔ ایک مسلمان کا مقصدِ حیات آزادی کی اس صلاحیت کو اللہ تعالیٰ کے احکامات کے تابع کرنا ہے اور ایک مسلمان عمل اپنی مرضی کے مطابق نہیں بلکہ حصولِ رضائے الٰہی کے لیے انجام دیتا ہے۔

---

[1] بزرگ دانشور اور ماہر معیشت، کراچی

آزادی بحیثیت ایک عقیدہ کے سترہویں اور اٹھارویں صدی عیسوی کی ایجاد ہے اور اس کے دو تخلیق کار ہیں فرانسیسی ڈیکارٹ اور جرمن ایمانویل کانٹ۔ ڈیکارٹ نے کہا: ’’میں سوچتا ہوں لہٰذا میں ہوں‘‘۔ یعنی فکر اور ادراک کی صلاحیت انسانی وجود کی بنیاد فراہم کرتی ہے۔ کانٹ نے دعویٰ کیا کہ انسانی ذہن کی ساخت فرد کو صحیح تصورات مرتب کرنے کے قابل بناتی ہے جو اس کے حواس خمسہ اطلاعات کی صورت میں اس کے ذہن کو فراہم کرتے ہیں۔ چوں کہ تمام انسانوں کے دماغ کی ساخت یکساں ہے لہٰذا صحیح تصورات اخذ کرنے کی صلاحیت ہر انسان رکھتا ہے۔ کانٹ کے مفروضے کے مطابق علم کے حصول کے لیے انسان خدا کا محتاج نہیں۔ کانٹ نے ڈیوڈ ہیوم کا تصورِ عقلیت قبول کیا۔ ہیوم کے مطابق عقلیت نفسانی خواہشات کی غلام ہے، کانٹ اس بات کو قبول کرتا ہے کہ عقلیت خواہشات نفسانی کے احکامات کو بجالانے کا ذریعہ ہے۔

جو نفوس احکامِ الٰہی کے تابع نہیں ہوتے ان کے فطری میلانات شہوت اور غضب کے غلام ہوتے ہیں اور کانٹ کے مطابق نظام اور طرز زندگی کو ان اصولوں کی بنیاد پر مرتب کرنا چاہیے جو ان فطری میلانات کے اختیار کرنے کا موقع ہر فرد کو فراہم کرے۔ اسی طرزِ حیات اور نظامِ زندگی کو سرمایہ داری کہتے ہیں۔ بیسوی صدی کی ابتدا میں اکبر نے کہا تھا

بھولتا جاتا ہے یورپ آسمانی باپ کو
بس خدا سمجھ رکھا ہے اس نے برق اور بھاپ کو

بقول فرانسیسی فلسفی میشائل فوکو یورپ کے آسمانی باپ کو بھولنے کا یہ عمل سولہویں صدی سے شروع ہوا۔ جب ہیومن بی انگ کی تخلیق شروع ہوئی۔ ہیومن بی انگ ہر انسان نہیں بلکہ صرف وہ انفرادیت ہے جو اپنی خود انحصاری، خود تخلیقیت اور خالقِ کائنات ہونے کا دعویٰ کرے۔ بقول جرمن پادری ہلمٹ فاسٹنر (Helmet fostner) ہیومن بی انگ انسان نہیں شیطانی وجود ہے کیوں کہ یہ دعوے تو انجیل مقدس کے مطابق ابلیس نے کیے تھے۔

ہیومن بی انگ کا یہ حق ہے کہ وہ جو چاہنا چاہے اس کے حصول کی تگ ودو کرے یہی حقِ خود ارادیت دیگر تمام ہیومن رائٹس کی اساسی روح ہے۔ ہر مخصوص پسند (مثلاً شراب پینا یا نہ پینا) اس عمومی پسند (شراب پینے یا نہ پینے) کے انتخاب کے حق کے تابع ہے۔ کوئی عمل فی نفسہٖ نہ خیر ہے نہ شر۔ ہر وہ عمل خیر ہے جسے کسی ہیومن بی انگ نے منتخب کیا ہو اور جس کے انجام دینے سے کسی

دوسرے ہیومن بی انگ کا یہ حق کہ وہ بھی جو عمل کرنا چاہے کر سکے، مسدود نہ ہو۔ یہ کانٹ کا اصولِ آفاقیت ہے اور خیر اور شر کے تعین کا واحد پیمانہ جس کی بنیاد پر قانون سرمایہ کی تحکیم قائم ہے۔

آزادی کے فروغ کا اصل ذریعہ سرمایہ ہے، سرمایے کو آزادی کی تجسیم کی ٹھوس شکل کہتے ہیں کیونکہ اس کے استعمال کے ذریعے آپ اپنی ہر مادی خواہش پوری سکتے ہیں۔ مسجد بھی بنا سکتے ہیں اور شراب خانہ بھی۔ پھر سرمایہ ایک آفاقی روحانی قوت بھی ہے کیونکہ ہر انسان کو حریص اور حاسد بنایا جا سکتا ہے (سوائے مومن کے)۔ ہر فرد کو سرمایہ دار بنایا جا سکتا ہے اور کسی فرد کا حاسد اور حریص بننا کسی دوسرے فرد کے حاسد اور حریص بننے میں رکاوٹ نہیں لہٰذا سرمایے کی بڑھوتری اور آزادی کا فروغ ایک سکے کے دو رخ ہیں۔ آزادی سرمایہ دارانہ نظام زندگی کا بنیادی عقیدہ ہے۔

لبرل فکر سے متاثر مسلمان مدبر کہتے ہیں کہ "آزادی کا مطلب انسان کو انسان کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی کے سپرد کرنا ہے"۔ لیکن تاریخ سے ثابت ہے کہ آزادی کے فروغ کے ذریعے انسان اللہ کی بندگی سے آزاد ہو کر اپنے نفس امارہ کے احکاماتِ رذیلہ کا غلام بن جاتا ہے۔

(انسان کو انسان کی غلامی سے نکال کر خدا کی غلامی میں دینے کا تاریخی جملہ حضرت سعد بن ابی وقاص ؓ کی جانب سے رستم کے پاس بھیجے گئے ابی بن عامر تمیمی نے کہا تھا۔ کسی لبرل فکر سے متاثر مسلمان مدبر کا قول نہیں)۔

تاریخ بتاتی ہے کہ آزادی پر ایمان لانے والے لبرل قوم پرست، اشتراکی، انارکسٹ، کبھی خدا کی غلامی اختیار نہیں کرتے۔ خود ارادیت خدا کے خلاف بغاوت کا دوسرا نام ہے۔

پھر خود ارادیت کے حصول کی جستجو اس نظام ہدایت کی نفی ہے جو اسلامی معاشرتی اور ریاستی تنظیم قائم کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اسلامی معاشرت مساویانہ نہیں درجہ بند ہے۔ اسلامی معاشرت اور ریاستی نظام میں متقین کی رہنمائی اور بالادستی قبول کی گئی ہے۔ یہ متقین کی ذمے داری ہے کہ وہ عوام کی رہنمائی کریں۔ آزادی کی تردید اس حد تک ہے کہ یہ شرع مطہرہ غلامی کے ادارے کی ممانعت نہیں کرتی اور یہ غلامی کا پھیلاؤ ہی تھا جس نے دو صدیوں کے اندر اندر غیر عرب اقوام کو مسلم خاندانی نظام میں منسلک کر دیا۔ دورِ حاضر میں آزادی اللہ سے بغاوت اور انسان کی خود انحصاریت اور خود تخلیقیت کا اعلان ہے۔ اسلامی انقلاب کا اولین مقصد اس بغاوت کو ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ختم کر دینا ہے۔

پاکستانیات　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　　محمد عاصم حفیظ

پاکستان میں چینی باشندوں کی شادیاں
ایک ابھرتا ہوا سماجی مسئلہ

چینی باشندوں کی پاکستانی لڑکیوں سے شادیاں معمول بنتی جا رہی ہیں۔ سی پیک منصوبوں کے لیے پاکستان میں مقیم چینی باشندے شادیاں کر رہے ہیں۔ کچھ تو الیکٹرانک میڈیا کی زینت بنتی ہیں لیکن ایک بڑی تعداد ایسی بھی ہے کہ جن کا تذکرہ میڈیا پر نہیں ہوتا۔ ہر آنے والے دن کے ساتھ یہ واقعات بڑھتے جا رہے ہیں۔

اس مسئلے کو سمجھنے کے لیے آپ کو چین کی آبادی میں مرد و عورت کی تعداد میں بڑے فرق اور وہاں کے سماجی حالات کو دیکھنا ہوگا۔ چین میں شادی شدہ جوڑوں کو صرف ایک بچہ پیدا کرنے کی اجازت ہے اور اس پابندی نے وہاں کے سماج کو بدل کر رکھ دیا ہے۔ وہاں کئی رشتے تو یکسر ختم ہو کر رہ گئے ہیں جیسے خالہ، ماموں، چچا، پھپھو وغیرہ۔ سب سے بڑا مسئلہ عورتوں اور مردوں کی تعداد میں فرق ہے۔ چین میں مردوں کی تعداد پانچ کروڑ زائد ہے۔ مغربیت کے زیر اثر خاندانی نظام کی تباہی نے کئی مسائل پیدا کیے ہیں۔ ماڈرن طرز زندگی اختیار کرنے کی وجہ سے بھی بہت سی لڑکیاں شادی کے بندھن کی بجائے سنگل رہنا پسند کرتی ہیں۔ یہی وجوہات ہیں جن کی وجہ سے چینی مردوں کے لیے شادی ایک بڑا مسئلہ ہے۔ چین کے کئی شہروں میں ایسے دفاتر موجود ہیں جو دیگر ممالک سے دلہنیں لا کر شادیاں کراتے ہیں یہ شادیاں بھاری معاوضے کے عوض کرائی جاتی ہیں۔ ابھی تک سب سے زیادہ شادیاں فلپین سے لائی لڑکیوں سے ہوتی ہیں۔ اگر آپ چینی میڈیا کو فالو کریں تو ایسی کئی خبریں نظر سے گزریں گی کہ شادی کے کچھ عرصہ بعد ہی دلہن غائب ہوگئی۔ کئی نیوز تو ایسی بھی ہوتی ہیں کہ گروہ کی شکل میں دلہنیں غائب ہو جاتی ہیں۔ دراصل شادی دفاتر کئی شادیاں اکٹھی کراتے ہیں، گروپ میں دلہنیں امپورٹ ہوتی ہیں۔ ایک شہر میں ایک ہی شادی دفتر کی جانب سے درجنوں نوجوانوں کی شادیاں کرائی گئیں اور ایک ہی روز تمام دلہنیں اکھٹی غائب ہوگئیں۔ اکثر دھوکے باز گروہ چینی نوجوانوں کی ان مجبوریوں کا فائدہ اٹھاتے ہیں اور ایسے بے شمار واقعات ہوتے ہیں کہ ان گروہوں سے منسلک لڑکیاں شادی کے بعد مال و دولت لے کر رفو چکر ہو جاتی ہیں۔

اگر آپ ان حالات کا مطالعہ کریں تو آپ کے لیے چینی باشندوں کی پاکستان میں شادیوں کی وجوہات سمجھ آ جائیں گی۔ وہ مسلمان ہونا قبول کر لیتے ہیں۔ سارے اخراجات برداشت کرنے پر تیار ہو جاتے ہیں اور اکثر اوقات ایجنٹ حضرات ان سے بڑی رقوم بھی وصول کرتے ہیں۔ دوسری طرف پاکستانی معاشرے میں لڑکیوں کی شادی ایک بڑا سماجی مسئلہ بنتا جا رہا ہے۔ رشتوں کی تلاش ایک مشکل مرحلہ ہے۔ والدین پریشان ہیں۔ غریب گھرانوں کے لیے تو یہ انتہائی سیریس مسئلہ ہے۔ اب چینی باشندوں کی جانب سے پاکستانی لڑکیوں کے ساتھ شادی کے واقعات بڑھتے جا رہے ہیں۔ پاکستانی سماجی ماہرین کو اس صورتحال کو سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان بڑھتے رشتوں سے معاشرتی پیچیدگیاں بھی بڑھ رہی ہیں۔ سب سے بڑا مسئلہ تو مذہب کی تبدیلی کا ہے۔ شادی کے لیے مذہب کی تبدیلی کا اعلان کرنا اور پوری زندگی کے لیے ایک دوسرے مذہب کی پیروی کرنا ایک دوسری صورت ہے۔ پاکستان میں ابھی تک چینی زبان میں دینی مواد اور علماء موجود ہی نہیں جو ان نومسلم چینی باشندوں کو دینی تعلیمات سمجھا سکیں۔ دوسری جانب ایک بھیانک صورت دھوکہ دہی کی بھی ہے۔ جس کے تحت وقتی طور پر شادی کر کے کچھ عرصہ بعد یہ چینی باشندے واپس لوٹ جاتے ہیں یا کسی دوسری جگہ جا کر ایک اور شادی رچا لیتے ہیں۔ ان خواتین کے بچوں کا تحفظ اور مستقبل کیا ہوگا؟ اگر اس بارے میں سنجیدگی سے غور نہ کیا گیا تو پاکستان دوسرا فلپین بن سکتا ہے جہاں سے غریب گھرانوں کی لڑکیوں کے بڑے بڑے گروہ چین بھیجے جائیں گی، جہاں ان کی شادیاں کرائی جائیں گے۔ جرائم پیشہ گروہ بھی اس صورتحال سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔

حکومت اور سنجیدہ حلقوں کو اس صورتحال پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ ان پاکستانی لڑکیوں کے حقوق کے حوالے سے لائحہ عمل بنانے کی ضرورت ہے تاکہ ان کی زندگیاں تباہ نہ ہوں۔ جرائم پیشہ گروہ اس صورتحال سے فائدہ نہ اٹھا سکیں۔ حکومتی سطح پر ان شادیوں کی رجسٹریشن، اگر یہ دلہنیں چین جاتی ہیں تو وہاں پر ان کے تحفظ اور دیگر معاملات کے حوالے سے اقدامات کرنے کی ضرورت ہے۔ یہ نہ ہو کہ شادی کے نام پر ان کو لے جا کر مجرمانہ سرگرمیوں کے لیے استعمال کیا جائے۔ دینی حلقوں کو بھی چاہیے کہ اگر کوئی چینی باشندہ واقعی مسلمان ہو کر شادی کرنا چاہتا ہے تو اس کی دینی تعلیم و تربیت کا اہتمام ہو نہ کہ بس کلمہ پڑھا کر نام بدلنے کو ہی کافی سمجھ لیا جائے۔ انہیں ایک مسلمان کے طور پر ازدواجی زندگی کی تعلیمات سکھانی چاہئیں۔

حاصل کلام یہ پاکستانی معاشرے میں یہ ایشو اگلے چند سالوں میں ایک بڑا سماجی مسئلہ بننے والا ہے جس پر معاشرے کے ہر طبقے کو غور کرنا چاہیے۔

پس نوشت

حال ہی میں قومی اسمبلی کی قائمہ کمیٹی برائے قانون و انصاف میں انکشاف ہوا ہے کہ پنجاب میں مختلف اضلاع میں چینی شہریوں نے غریب پاکستانی بچیوں کے خاندانوں کو پیسے دے کر ان سے شادیاں کیں۔ شادی کے بعد انہیں اپنے ساتھ چین لے گئے جہاں ان کے جسم کے اعضاء نکالے گئے۔ خصوصاً جگر کی پیوند کاری کے لیے عطیہ اور ایک گردہ نکالا گیا اور بعد میں انہیں واپس پاکستان بھیج دیا گیا۔ استحصال کا شکار ہونے والی اکثر بچیاں غیر تعلیم یافتہ اور انتہائی غریب گھرانوں سے تعلق رکھتی ہیں جس کی وجہ سے وہ قانونی چارہ جوئی کے قابل بھی نہیں ہیں۔

یہ بات بھی سامنے آئی کہ ملک میں جرائم پیشہ افراد کا ایک ایسا منظم گروہ سرگرم ہے جو انتہائی غریب گھرانوں کو لالچ دے کر انہیں اپنی بچیوں کی چینیوں سے شادی پر آمادہ کرتا ہے۔ اس سلسلے میں ملحد چینی باشندے باقاعدہ قبول اسلام کا ڈرامہ بھی کرتے ہیں لیکن اکثر کیسز میں یہ سارا دھندا صرف بچیوں کے جسمانی اعضا ہتھیانے کے لیے ہوتا ہے۔

بقیہ: اسلام میں انتہا پسندی کا مفہوم

❁ اور بات صرف شعبۂ تعلیم کی نہیں۔ اس ملک میں یہاں کے حکمرانوں نے احکام شریعت پر عمل نہ کرنے اور شریعت نافذ نہ کرنے کو اپنا منہج اور وطیرہ بنالیا ہے اور وہ اس پر مصر ہیں۔ کیا یہ انتہا پسندی نہیں؟ کیا یہ غیر شرعی نہیں؟ اور دینی قوتوں نے اس صورت حال کو قبول کرلیا ہوا ہے، وہ اس کے لیے متحد ہو کر جدوجہد کرنے اور اسے کامیاب بنانے کے لیے تیار نہیں کیونکہ انہیں اپنا اپنا فرقہ اور اپنے اپنے مسلکی مفادات اللہ کے دین سے عزیز تر ہیں۔ کیا یہ غیر شرعی نہیں؟ کیوں اس ملک کی دینی قوتیں اصلاح فرد اور معاشرہ کے لیے یکسو ہو کر اور متحد ہو کر محنت نہیں کرتیں؟ کیوں وہ دینی مدارس کی اصلاح نہیں کرتیں؟ کیوں وہ جدید تعلیم کو اسلام کے مطابق بنانے کے لیے جدوجہد نہیں کرتیں؟ کوئی ہے جو ہمارے ان سوالوں کا جواب دے؟ کوئی ہے جو ہماری ان گزارشات پر غور کرے؟

پاکستانیات

پروفیسر ملک محمد حسین

عصرِ حاضر میں تبدیلی کا ذریعہ تو بیلٹ بکس ہی ہے لیکن....

سیاست میں، حکومت میں تبدیلی، کئی طریقوں سے لائی جا سکتی ہے۔ ایک طریقہ تو قوت سے تبدیلی لانے کا ہے جیسے ہمارے ملک میں جنرل ایوب خان، جنرل ضیاء الحق اور جنرل مشرف لے آئے۔ دس، دس سال تک تینوں نے حکومت کی جس سے حکومت میں تبدیلی تو آئی لیکن معاشرت میں، معاشی کیفیات میں، عدل وانصاف کی فراہمی میں اور امن وامان کے دیر پا قیام میں کوئی تبدیلی نہیں آئی۔ معاشرے پر حاکم کا ذہن کارفرما رہا، جونہی حاکم بدلا سب کچھ بدل گیا۔ ایک تبدیلی جناب ذوالفقار علی بھٹو بھی لائے تھے۔ یہ تبدیلی غریب کے نام پر نعرے بازی کے نتیجے میں آئی۔ کچھ عرصے کے بعد نعرہ ہوا میں تحلیل ہو گیا اور اندر سے وہی استحصالی نظام برآمد ہوا۔ اسلامی سوشلزم کا غلغلہ ضرور رہا لیکن نہ اسلام کی برکتیں سامنے آئیں نہ سوشلزم کے دعوے روبہ عمل ہوئے۔ خیبر پختون خواہ میں ایک تبدیلی متحدہ مجلس عمل (MMA) لائی تھی۔ ان دنوں کے ایک استاد سے پوچھا کہ ایم ایم اے کی حکومت سے کیا تبدیلی آئی ہے تو جواب تھا کہ پہلے ملازمانہ مسائل کے حل اور تبادلوں وغیرہ کے لیے سیاست دانوں کے حجروں کا طواف کرنا پڑتا تھا اب مدرسہ اور مسجد کے بڑے مولوی صاحب کی منت سماجت کرنا پڑتی ہے۔ اب ایک تبدیلی کرپشن کا نعرہ لگا کر عمران خان لایا ہے لیکن ایک طرف پکڑ دھکڑ ہے تو دوسری طرف کرپشن زیادہ ننگا ناچ، ناچ رہی ہے۔ بات تو ریاست مدینہ کی ہوتی ہے لیکن سب کچھ اللہ اور اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم کی نافرمانی میں ہو رہا ہے۔

وجہ کیا ہے؟ وجہ اس کی یہ ہے کہ نہ ذہن بدلا، نہ طور اطوار بدلے، نہ پولیس بدلی نہ بیوروکریسی بدلی۔ طریقہ وہی ہے کہ انصاف لینا ہے تو وکیل کی بجائے جج کر لو۔ کام کروانا ہے تو قائداعظم کی تصویر والا نیلا، سرخ، سبز نوٹ آگے کر دو۔ نوکری لینی ہے تو ٦ ماہ کی تنخواہ پیشگی ادا کرنے کا انتظام کر لو۔ (بقیہ صفحہ نمبر: ۵۸)

پاکستانیات مدیر

چین ۔ نیا استعمار؟

پچھلے دنوں اخبارات میں خبر آئی تھی کہ قرض ادا نہ کر سکنے کی پاداش میں چین نے افریقا کے ملک زیمبیا کے دارالحکومت لوکاسا میں واقع لوکاسا انٹرنیشنل ائرپورٹ کا کنٹرول حاصل کر لیا ہے۔ اس سے قبل چین زیمبیا میں قرض کے عوض زیمبیا ہی کی قومی براڈ کاسٹنگ کمپنی ZNBC اور بجلی فراہم کرنے والی کمپنی ZESCO کا کنٹرول بھی حاصل کر چکا ہے۔

دیگر کئی ممالک کی طرح زیمبیا بھی چینی قرضوں کے جال میں ۲۰۰۰ء کے عشرے میں پھنسا۔ زیمبیا پر مجموعی طور پر 7.8 ارب ڈالر کا بیرونی قرضہ ہے۔ اس میں سے چین سے حاصل کیے گئے قرض کی مالیت 4.6 ارب ڈالر ہے۔ یہ سارا قرضہ وَن بیلٹ وَن روڈ نامی جال میں پھنسا کر زیمبیا کو دیا گیا۔

براعظم افریقہ میں یہ چین کی پہلی پیش قدمی ہے۔ اس سے قبل چین سری لنکا کی بندرگاہ ہم بنٹوٹا اور تاجکستان کی ایک ہزار مربع کلومیٹرز مین نادہندگی کے جرم میں حاصل کر چکا ہے۔

طریق واردات بڑا سادہ ہے۔ مختلف ممالک کے کرپٹ حکمرانوں کے ساتھ مل کر میگا پراجیکٹس کے نام پر بھاری شرح سود اور سخت شرائط پر بھاری بھرکم قرضے جاری کیے جاتے ہیں۔ پھر کوشش کی جاتی ہے کہ قرض کی رقم مطلوبہ پراجیکٹس پر نہ لگے اور سود کی ادائی شروع ہو جائے۔ پھر جب مقررہ مدت پر سود سمیت قرضے واپس نہیں ہو پاتے تو غریب ممالک گروی رکھی گئی ضمانتوں سے بامر مجبوری دستبرداری تسلیم کر لیتے ہیں۔ ایک اور چیز یقینی بنائی جاتی ہے کہ قرض، سود اور شرائط کی تمام تر تفصیلات کسی صورت پبلک نہ ہو پائیں تاکہ کسی بھی ممکنہ احتجاج سے بچا جا سکے۔

ان سب باتوں کو ذہن میں رکھتے ہوئے پاکستان اور چین کے مابین معاہدوں کا جائزہ لیں۔ CPEC کے میگا پراجیکٹس میں سے کسی ایک پراجیکٹ کی تفصیلات پبلک نہیں کی گئی۔

نہ پتہ ہے قرضہ کتنا ہے اور امداد کتنی اور نہ ہی شرح سود و دیگر شرائط کا کسی کو علم ہے۔ حال ہی میں ایک انکشاف یہ ہوا کہ اورنج لائین میٹرو مکمل طور پر بھاری سود پر قرض لے کر بنائی گئی اور شروع ہونے سے پہلے ہی سالانہ اربوں روپے سود میں ادا کرنا ہوں گے۔

ضرورت اس امر کی ہے کہ جس طرح ملائشیا میں مہاتیر محمد نے برسراقتدار آتے ہی تمام معاہدوں کا ازسرنو جائزہ لیا اور متعدد معاہدے منسوخ کر دیے اسی طرح پاکستان بھی تمام منصوبوں اور معاہدوں کو پبلک بھی کرے اور تمام معاہدوں کا ازسرنو جائزہ لے کر ایسے تمام معاہدے منسوخ کرے جن سے ملکی سالمیت کو خطرہ درپیش ہوسکتا ہے۔

اقبال نے کہا تھا کہ مجھے گلہ یورپ سے نہیں اپنوں سے ہے کہ انہوں نے یورپ کی غلامی کیوں قبول کر لی؟ اسی طرح ہمیں چین سے گلہ نہیں کہ وہ پاکستان سے معاہدوں کو عام نہیں ہونے دے رہا بلکہ گلہ اپنی حکومتوں سے ہے کہ وہ کیوں چین سے معاہدوں کی تفصیل چھپا رہے ہیں؟ ساری دنیا چیخ رہی ہے کہ چینی حکمران ترکستان کی مسلمان آبادی پر ظلم وستم ڈھا رہے ہیں لاکھوں کو جبری کیمپوں میں دھکیل دیا گیا ہے۔ ان کے نماز روزے اور لباس پر پابندی ہے۔ انہوں نے مزاحمت کی کوشش کی اور ہمارے قبائلی علاقوں سے تربیت لینے کی کوشش کی تو پاکستانی اسٹیبلشمنٹ نے انہیں کچلنے میں چین کی مدد کی۔ دوسری طرف گوادر کے ذریعے گرم پانیوں تک رسائی آپ نے طشتری میں رکھ کر چین کو پیش کر دی اور نہ صرف گوادر بلکہ پورا بلوچستان اب چینیوں کے رحم وکرم پر ہے۔ ہمیں گلہ اپنے حکمرانوں سے ہے جو خوئے غلامی میں مبتلا ہیں (فکری غلامی بھی تو غلامی ہی کی ایک قسم ہے) اور پاکستان کی نظریاتی اور جغرافیائی سرحدوں کی حفاظت نہیں کر پا رہے۔ اتنی بڑی سٹریٹجک تبدیلی کہ بلوچستان کے گرم پانیوں تک جس رسائی کے لالچ میں عظیم USSR ٹوٹ گیا وہ آپ نے ون بیلٹ ون روڈ کے نام پر طشتری میں رکھ کر چین کو دے دی اور اس کو کوئی قیمت بھی وصول نہ کی۔ کیا یہ وہی غلامانہ رویہ نہیں جو مشرف نے امریکہ کے ساتھ اختیار کیا تھا؟ الیس منکم رجل رشید؟

عالمِ اسلام

شیخ اسعد بیوض التمیمی
سابق خطیب مسجد اقصیٰ
اُردو ترجمانی: مدیر

ہم نے بیت المقدس کیسے کھویا؟

امت کے زوال کا سبب زوالِ ایمان ہے

یہ سطور مَیں سقوط قدس کی ۵۱ ویں برسی پر تحریر کر رہا ہوں جب انسانی تاریخ کا یہ شرمناک ترین واقعہ پیش آیا کہ ۳۰ لاکھ یہودیوں نے ۱۵ کروڑ عربوں کو شکست فاش سے دوچار کیا۔

جس وقت سقوط قدس ہوا مَیں دفتری کام سے بیروت گیا ہوا تھا۔ مَیں القدس میں یتیم خانے کا ڈائریکٹر تھا اور یتیم خانے کے پریس کے لیے کاغذ خریدنے گیا ہوا تھا۔ سقوط کے تین دن بعد مَیں عمان (اردن) واپس آیا۔ مَیں عمان کی ایک شاہراہ سے گزر رہا تھا جب میری ملاقات اس وقت کی اردنی خفیہ ایجنسی کے سربراہ زید الکیلانی سے ہوئی۔ اس نے مجھے کہا کہ کیا تم نے میرے بھائی ابراہیم کو ایک ہفتہ پہلے بیت المقدس میں کہا تھا کہ مسجد اقصیٰ میں الوداعی نماز پڑھ لو کیونکہ تم یہاں واپس نہ آسکو گے؟.... دراصل ہوا یہ تھا کہ اس کا بھائی ابراہیم جو ریڈیو میں دینی پروگراموں کا انچارج تھا، مجھے القدس میں ملا اور میری تقریر ریکارڈ کرنا چاہی۔ یہ وہ وقت تھا جب جنگ کے سائے منڈلا رہے تھے اور مصر کے جمال عبدالناصر نے سیناء سے بین الاقوامی مبصر فورس کو واپس بلا لیا تھا (جس کے نتیجے میں بقیہ فلسطین، سینا اور گولان کی پہاڑیوں پر بعد میں اسرائیل نے قبضہ کر لیا تھا)۔

جب شیخ ابراہیم میری تقریر ریکارڈ کرنے لگا تو مَیں نے کہا شیخ ابراہیم! خدا کی قسم یہ امت نہ ’انقلابیوں‘ کے ذریعے فتح پا سکتی ہے اور نہ رجعت پسندوں کے ذریعے بلکہ شکست اس کے مقدر میں لکھ دی گئی ہے کیونکہ یہ امت اپنے عقیدے پر نہیں لڑ رہی بلکہ یہ تو اپنے ربّ کے خلاف اعلانِ جنگ کر چکی ہے۔ شیخ ابراہیم نے کہا: یہ بات مَیں ریڈیو سے کیسے نشر کر سکتا ہوں؟ مَیں نے کہا: ریکارڈ کر لو۔ تاریخ کے کام آئے گی.... پھر ہم دفتر سے اُتر کر نیچے مسجد (اقصیٰ)

میں آئے اور ظہر کی نماز پڑھی۔ مَیں نے پھر اصرار سے شیخ ابراہیم سے کہا کہ اقصیٰ میں الوداعی نماز پڑھ لو کیونکہ تمہیں یہاں لوٹنا نصیب نہیں ہوگا۔ (بعد میں شیخ ابراہیم نے یہ واقعہ عمان کی مساجد و محافل میں کئی بار لوگوں کو بتایا)....دراصل میرے ذہن میں یہ بات بیٹھ گئی تھی کہ یہ میری اقصیٰ میں الوداعی نماز ہے۔ میں اقصیٰ کے درو دیوار کو دیکھتا تھا اور پھر آنکھیں بند کر کے ان کے خدوخال کا تصور کرتا تھا کہ مجھے مستقبل میں یہی کرنا تھا....زید الکیلانی نے مجھ سے پوچھا: تمہیں کیسے یقین تھا کہ یہی ہوگا؟ میرے منہ سے بے اختیار نکلا: اگر تم لوگ فاتح ٹھہرتے تو خدانخواستہ مَیں شک کرتا کہ قرآن واقعی اللہ کی طرف سے ہے؟ ناکام حکومتیں اور ان کے ہاتھوں میں کٹھ پتلی عوام اور سب دین سے دور۔ نتائج ہمیشہ منطقی عوامل کی پیداوار ہوتے ہیں تو اس کے برعکس کیسے ہوتا؟ مجھے یقین تھا کہ تم لوگوں کو شکست ہوگی....لیکن یہ میرے خواب وخیال میں بھی نہیں تھا کہ تم دو گھنٹوں میں دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوگے، نہ چھ سال، نہ چھ مہینے ، نہ چھ دن....ظلم خدا کا صرف دو گھنٹوں میں شکست!

پھر مَیں نے اسے کہا: لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ مَیں مایوس ہوں۔ ان شاء اللہ وہ وقت دور نہیں ہے جب اس امت سے وہ لوگ اٹھیں گے جو صرف اللہ کے لیے لڑنے نکلیں گے، نہ کہ قومیت کے لیے، نہ اشتراکیت کے لیے، نہ نظام سرمایہ داری کے لیے، نہ شرق کے لیے، نہ غرب کے لیے بلکہ صرف اللہ کے لیے....اس وقت یقیناً ہمیں فتح نصیب ہوگی۔

زید الکیلانی کے ذریعے میری یہ رائے خصوصاً یہ الفاظ ''کہ اگر عرب اس جنگ میں جیت جاتے تو مَیں سمجھتا کہ قرآن اللہ کی طرف سے نازل کردہ نہیں ہے'' سیاسی حلقوں میں پھیل گئے۔ اس دوران سعودی عرب کے امیر سلطان بن عبدالعزیز کرک میں متعین سعودی دستوں کے معاینے کے لیے آئے اور اس وقت کے سعودی سفیر احمد الکحیمی نے انہیں عشائیہ دیا۔ اس عشائیے میں میرے علاوہ بہت سے سیاسی زعما خصوصاً وصفی التل بھی موجود تھے۔ وصفی التل نے مجلس میں دورانِ گفتگو کہا کہ ہمارے ہاں ایک شیخ ہیں جن کا نام اسعد التمیمی ہے جو کہتے ہیں کہ اگر عرب اس جنگ میں جیت جاتے تو مَیں سمجھتا کہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہے۔ سفیر

الکیحمی نے کہا کہ اتفاق سے شیخ التمیمی یہاں موجود ہیں۔ وہ میرے پاس آئے اور میرا بازو تھامے مجھے مجلس میں لے گئے اور امیر سلطان سے میرا تعارف کرایا۔ امیر سلطان بن عبدالعزیز نے مجھ سے پوچھا کہ آپ کیسے کہتے ہیں کہ اگر اس جنگ میں عربوں کو فتح ہو جاتی تو آپ سمجھتے کہ قرآن اللہ کی طرف سے نہیں ہے؟ میں نے کہا: جناب بات یہ ہے کہ قرآن حکیم نے نصرت الٰہی کا مستحق ہونے کی کچھ شرائط بیان کی ہیں جن پر آپ لوگ پورے نہیں اُترتے۔ امیر سلطان نے کہا کہ اس کا ذمہ دار جمال عبدالناصر ہے۔ مَیں نے کہا کہ مَیں جمال عبدالناصر کو بہت اچھی طرح جانتا ہوں لیکن وہ اکیلا اس صورتِ حال کا ذمہ دار نہیں ہے بلکہ آپ سب لوگ شریک جرم ہیں۔ ہاں آپ یہ کہہ سکتے ہیں کہ ناصر کا حصہ دوسروں سے زیادہ ہے۔

اس مجلس میں اردنی فوج کے سپہ سالار جنرل حابس المجالی بھی موجود تھے۔ میں ان کے پاس گیا، دونوں ہاتھ ان کے سر پہ رکھے اور کہا: آپ کو اس ربّ کی قسم جس نے آپ کو پیدا کیا ہے، اپنی ایمان دارانہ رائے بتایئے کہ کیا آپ فتح کا استحقاق رکھتے تھے؟ جنرل نے کہا: نہیں۔ مَیں امیر سلطان بن عبدالعزیز کی طرف مڑا اور کہا: لیجیے! اردنی فوج کے لیڈر یہی تو تھے.... مَیں نے اپنی بات جاری رکھی اور کہا کہ مَیں مسجد اقصیٰ میں اپنے ہفتہ وار دروس میں لوگوں کو اس آنے والی ذلت ونکبت پر متنبہ کیا کرتا تھا اور کہا کرتا تھا کہ اگر امت نے اپنے چالے نہ بدلے خصوصاً اللہ کے مقابلے میں تمرد سے وہ باز نہ آئی تو ہونی ہو کر رہے گی۔ اس کی مثال یہ ہے کہ ۱۹۶۴ء میں جب یاسر عرفات کی صدارت میں 'منظمہ التحریر' کی پہلی مؤتمر ہوئی اور اس میں 'میثاقِ فلسطین' کا مسودہ تیار ہو رہا تھا تو اس میں لکھا جا رہا تھا کہ ''آزادیٔ فلسطین کی ذمہ داری فلسطینیوں اور عربوں کی ہے''۔ کسی نے کہا کہ اس میں ''مسلمانوں'' کا لفظ بھی شامل کر لیا جائے۔ اس پر فقرہ کسا گیا کہ ''یہ تو رجعت پسندی ہے''۔ اس پر مجلس میں تند و تیز اختلافی بحث چھڑ گئی۔ بالآخر یہ طے پایا کہ اس پر ووٹنگ کرالی جائے۔ جو لوگ کہہ رہے تھے کہ فلسطین اسلام اور مسلمانوں کا بھی قضیہ ہے ان کے ووٹوں کی تعداد ۱۵۱ نکلی اور جن لوگوں کی یہ رائے تھی کہ فلسطین صرف فلسطینیوں اور عربوں کا مسئلہ ہے، اسلام اور مسلمانوں کا نہیں، انہیں ۱۶۲ ووٹ ملے۔ جیتنے والوں نے نعرہ لگایا کہ آج اسلام اور اسلامسٹ ہار گئے۔

یہ دیکھ اور سن کر میں غصے سے کانپنے لگا اور میرے اعصاب چٹخنے لگے۔ میرا دل چاہا کہ کاش کل جمعہ ہوتا اور میں مسجد اقصیٰ کے منبر سے اپنی آواز اٹھاتا۔ مجھے صاف نظر آ رہا تھا کہ ان لوگوں نے اسلام کا مذاق اڑا کر اللہ کے عذاب کو دعوت دی ہے اور اس طرح کے کافرانہ فیصلوں سے وہ سارے فلسطینیوں کا بیڑا غرق کریں گے.....بہرحال جمعہ آیا اور اس میں فلسطینی موتمر میں آئے ہوئے کئی ملکوں کے صدور، وزراءاعظم اور بادشاہ بھی نماز جمعہ پڑھنے مسجد اقصیٰ میں آئے ہوئے تھے۔ مَیں نے اس موقعہ کو غنیمت جانا اور کہا: ''اے ربّ کریم! ہمیں معاف فرما اور ہم میں سے جن احمقوں نے یہ فیصلہ کیا ہے، اس پر ہماری پکڑ نہ فرما۔ اے دنیا بھر کے مسلمانو! پاکستان میں رہنے والو، افغانستان میں رہنے والو، ترکی میں رہنے والو، نائیجریا میں رہنے والو، ہم آپ سے معذرت خواہ ہیں۔ ہم میں سے جن احمقوں نے یہ فیصلہ کیا ہے، اس پر ہم آپ سے شرمندہ ہیں، آپ ہمیں معاف کر دیں۔''

''اے صلاح الدین! تم تو کرد تھے فلسطینی نہ تھے، صدیوں کی اوٹ سے جھانک کر دیکھو کہ ان پاگل کے بچوں نے جبل زیتون پر کیا فیصلہ کیا ہے؟ ان لوگوں نے جو فیصلہ کیا ہے اس پر یقیناً پوپ خوشی سے رقص کر رہا ہوگا۔ ان لوگوں کے اس فیصلے سے اللہ کے غضب کی وجہ سے یقیناً باقی بچا کچھا فلسطین بھی جلد یہودیوں کے قبضے میں چلا جائے گا۔ ارے سوچو! اگر اسلام نہ ہوتا تو فلسطین عربی کیسے ہوتا؟ ان لوگوں کی آنکھیں ہیں لیکن انہیں نظر نہیں آتا، ان کے کان ہیں لیکن یہ حق سن نہیں پاتے، ان کے پاس دل و دماغ ہیں لیکن ان پر مہر لگ گئی ہے (جیسا کہ فرمانِ الٰہی ہے کہ [illegible] غِشَاوَةٌ وَّلَهُمْ عَذَابٌ عَظِيْمٌ)[البقرہ ۲:۷]۔ تو نافرمانوں پر اللہ کا عذاب تو آئے گا، یہ اس کا وعدہ ہے، یہ اس کی سنت ہے۔

مختصر تبصرے

میڈیا کی منافقت

ہمارا میڈیا منافقت اور دورنگی کا شاہکار ہے۔ مسلمان لڑکی گھر سے بھاگ کر شادی کرلے تو خاموش رہتا ہے۔ دو ہندو لڑکیوں نے بھاگ کر مسلمان لڑکوں سے شادی کرلی تو اس نے آسمان سر پر اٹھالیا۔ ہندو لڑکیوں کے روتے کرلاتے والدین ہر چینل کی زینت تھے۔ مسلمان لڑکیاں گھر سے بھاگ کر شادی کرلیں تو ان کے روتے کرلاتے والدین کبھی ٹی وی پر نظر نہیں آتے!

مولویوں کی شامت۔ پروپیگنڈا یہ ہے کہ لڑکیاں نابالغ ہیں اور انہیں زبردستی اسلام قبول کروایا جاتا ہے۔ نکاح خواں ابھی تک گرفتار ہے۔ ساری حکومت حرکت میں ہے، وزیر اعظم صاحب دنیا کو یقین دلا رہے ہیں کہ اقلیتوں کے ساتھ ناانصافی نہ ہوگی۔ میڈیکل رپورٹ نے ثابت کردیا کہ لڑکیاں بالغ ہیں۔ انہوں نے عدالت میں بیان دیا کہ انہوں نے اپنی مرضی سے اسلام قبول کیا ہے لیکن میڈیا کے لبرلسٹوں اور سیکولرسٹوں کے سینے پر سانپ دوڑ رہے ہیں۔

ہم مولانا فضل الرحمن اور ان کی طرز سیاست کے کبھی مداح نہیں رہے لیکن ہم یہ سمجھنے سے قاصر ہیں کہ میڈیا کس اصول کے تحت ان کی سیاسی جدوجہد کا بائیکاٹ کیے ہوئے ہے۔ وہ دیگر سیاسی لوگوں کے جلسوں کی کوریج کرتا ہے لیکن مولانا کے ملین مارچ نہیں دکھاتا! کیوں؟

قحط الرجال (عمران خان کی ناکامی کا اصل سبب)

عمران خان کی کابینہ اور بیوروکریسی میں اتھل پتھل۔ پچھلے ۸ ماہ میں ناکامیوں کی ہیٹ ٹرک

ہمیں پہلے دن سے یقین تھا کہ عمران خاں صاحب پاکستان میں کوئی مثبت تبدیلی لانے میں کامیاب نہیں ہوسکیں گے۔ اس کے لیے ہمیں علم نجوم جاننے کی ضرورت نہ تھی۔ ظاہر ہے تبدیلی انسانوں کے ذریعے آتی ہے۔ ان انسانوں کے ہاتھوں جو تبدیلی لانے کی صلاحیت اور

جذبہ رکھتے ہوں اور اپنے اندر وہ تبدیلی لا چکے ہوں۔ عمران خاں صاحب کے پاس وہ ٹیم نہیں تھی، اور نہیں ہے، جو تبدیلی لا سکے۔ انہوں نے وہ افراد تیار ہی نہیں کیے جو تبدیلی لا سکتے۔

ہم اسلامی تبدیلی کی بات نہیں کر رہے کہ وہ تو عمران خان صاحب کے پیش نظر تھی ہی نہیں۔ (اپنے نعروں میں ’ریاست مدینہ‘ کا نعرہ شامل کرنے کے باوجود.... کہ وہ محض ایک نعرہ تھا مسلمان ووٹروں کو لبھانے کا)۔

تبدیلی کا سب سے بڑا ماڈل حضرت محمد ﷺ کی ذات گرامی ہے جنہوں نے ساری زندگی ایسے انسان تیار کرنے میں لگا دی جو مطلوبہ تبدیلی پہلے اپنی ذات میں لائے اور پھر دوسروں کے اندر لائے۔ انسان تیار کرنے کی اس جدوجہد کے پہلے مرحلے میں وہ تیرہ سال میں چند سو اور دوسرے مرحلے میں دس سال میں چند ہزار نفوس تیار کرنے میں، بتائید ایزدی، کامیاب ہوئے اور آپ ﷺ جو دنیا کا سب سے بڑا اور جامع ترین اسلامی انقلاب لانے میں کامیاب ہوئے تو یہ کامیابی انہی افراد کے ذریعے ملی۔ تبدیلی لانے کا یہی قرآنی اور نبوی نسخہ ہے۔

عمران خان صاحب افراد تیار کیے بغیر تبدیلی کیسے لا سکتے ہیں؟ یہ خلاف فطرت، خلافِ عقل اور خلافِ منطق ہے۔ انہیں اقتدار میں آنے کے لیے Electables کی ضرورت تھی اور اسٹیبلشمنٹ کی حمایت کی۔ یہ دونوں چیزیں انہیں مل گئی اور وہ اقتدار میں آ گئے۔ وہ تبدیلی بھی لے آئیں، اس کا امکان ہمیں تو نظر نہیں آتا۔

ہمارے بزدل حکمران

پلوامہ میں حملہ ہوا۔ بنیے نے وہاں مسلمان جماعتوں پر پابندی لگا دی۔ بھارت اور امریکہ نے پاکستان پر دباؤ ڈالا تو یہاں بھی دینی جماعتوں پر پابندی لگ گئی۔ درازوں میں پڑا ہوا نیشنل ایکشن پلان میزوں پر آ گیا۔ ہاہا کار مچ گئی۔ مدرسے بند ہونے لگے، علماء گرفتار ہونا شروع ہوئے۔ سوال یہ ہے کہ ہمارے حکمران اتنے بزدل کیوں ہیں؟ ذرا سا دباؤ بھی یہ برداشت نہیں کرتے۔ بھائی! ان کو جواب دو۔ ہم دہشت گرد نہیں ہیں۔ ہمارے ہاں دہشت گرد تنظیمیں نہیں ہیں۔ جماعت الدعوۃ پر پابندی لگانے کا مطلب تو یہ ہے کہ گویا آپ تسلیم

کررہے ہیں کہ یہ دہشت گرد تنظیم ہے۔اگر یہ دہشت گرد تنظیم تھی تو یہ کام کیسے کررہی تھی؟ الیکشن میں حصہ لے رہی تھی، ویلفیئر کے کام کررہی تھی، سکول اور مدرسے چلا رہی تھی۔اس وقت آپ کو پتہ نہیں تھا کہ یہ دہشت گرد تنظیم ہے؟ امریکہ اور بھارت کے دباؤ میں آ کر آپ اس پر پابندی کس منہ سے لگاتے ہیں؟ شرم ان کو مگر نہیں آتی۔

سب سے بڑا دہشت گرد

سارے مسلمان بلکہ ساری دنیا جانتی ہے کہ امریکہ اس وقت دنیا کا سب سے بڑا دہشت گرد ملک ہے اور اس کی فوج سب سے زیادہ دہشت گردی میں ملوث ہے لیکن کسی میں ہمت نہیں کہ یہ بات اسے کہہ سکے۔دوسری طرف امریکہ جسے چاہتا ہے دہشت گرد قرار دے دیتا ہے، خواہ وہ دہشت گرد ہو یا نہ ہو۔اور پھر ساری دنیا، اقوام متحدہ سمیت، اسے دہشت گرد کہنا شروع کر دیتی ہے۔ پاکستان پر عرصے سے دہشت گردی کا الزام لگایا جاتا ہے جبکہ حقیقت یہ ہے کہ پاکستان دہشت گرد نہیں بلکہ دہشت گردی کا شکار ہے اور امریکہ، بھارت، افغانستان ، اسرائیل مل کر اس پر دہشت گردانہ حملے کراتے رہتے ہیں۔بھارت کشمیر میں ریاستی دہشت گردی کررہا ہے لیکن اسے کوئی دہشت گرد نہیں کہتا۔

حال ہی میں امریکہ نے ایرانی پاسداران انقلاب کو دہشت گرد قرار دے دیا ہے۔اس میں شک نہیں کہ ساری دنیا کے سنّی مسلمان ایران کی شام اور یمن میں مداخلت سے نالاں ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ جو خود سب سے بڑا دہشت گرد ہو وہ کسی دوسرے کو دہشت گردی کا طعنہ کیسے دے سکتا ہے؟ امریکی دہشت گردی کا تو یہ حال ہے کہ وہ دہشت گردی کرتا ہے اور کسی کو یہ کہنے بھی نہیں دیتا کہ تم دہشت گرد ہو۔چنانچہ حال ہی میں اس نے عالمی عدالت انصاف کو دھمکایا کہ خبردار امریکہ کی افغانستان میں دہشت گردی کو زیر بحث نہ لاؤ۔اور اس کی دہشت کا یہ عالم ہے کہ عدالت کے جج واقعی خوف کھا گئے اور انہوں نے کیس سننے سے انکار کر دیا۔

جہاد کا متجددانہ تصور

حال ہی میں ڈاکٹر طاہر القادری صاحب کو OIC نے بلایا تا کہ مسلمانوں میں انتہا

پسندی کے خلاف ان کی کوششوں کو سراہا جائے اور ان کے خیالات سے استفادہ کیا جائے۔ ڈاکٹر صاحب غلام احمد قادیانی، جاوید احمد غامدی، مولانا وحید الدین خاں اور اس طرح کے دوسرے ان امن پسندوں کی قبیل کے آدمی ہیں جو یک چشم ہیں یعنی انہیں مغرب کا مسلمانوں پر جبر اور ظلم وستم نظر نہیں آتا لیکن اس ظلم وستم کے ردّعمل میں اگر بعض مسلمان ہتھیار اٹھالیں تو انہیں خوارج یاد آنے لگتے ہیں۔ یہاں تک کہ انہیں بریلوی ہونے اور عشق رسول کا دعویٰ رکھنے کے باوجود شاتم رسول کو قتل کرنے کے موقف سے پسپا ہونا پڑا تاکہ یہ امر مغرب کی خوشنودی حاصل کرنے میں رکاوٹ نہ بنے۔ شاید ان کے نزدیک مغرب معیار حق و باطل ہے۔ حق وہ ہے جسے مغرب حق سمجھے اور باطل وہ ہے جسے مغرب باطل قرار دے۔

بقیہ: عصرِ حاضر میں تبدیلی کا ذریعہ تو بیلٹ بکس ہی ہے لیکن

ادھر ہم اہل اسلام بھی تبدیلی کا خواب دیکھ رہے ہیں اور ذہن بدلے بغیر بیلٹ بکس سے اسلامی نظام برآمد کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ یہ صحیح ہے کہ روحِ عصر کے مطابق اب پُرامن تبدیلی کا ذریعہ بیلٹ بکس ہی ہے لیکن بیلٹ بکس میں پرچی ڈالنے والوں کا ذہن بدلے بغیر محض تقریروں، نعروں اور ریلیوں سے کچھ حاصل نہیں ہوگا اور اگر کچھ حاصل ہو بھی گیا تو وہی نتیجہ نکلے گا جو خیبر پختون خواہ میں ایم ایم اے کی حکومت قائم ہونے سے نکلا۔ نہ حکمرانوں کے پاس کوئی ایجنڈا تھا نہ وہ فنکشنریز (Functionaries) تیار تھے جنہوں نے کوئی تبدیلی کا ایجنڈا نافذ کرنا تھا اور نہ ہی شاید وہ رعایا تیار تھی جس کے لیے تبدیلی کا ایجنڈا لایا جانا تھا۔ تبدیلی نہیں آئے گی جب تک ہم تبدیلی کے لیے انسان سازی نہیں کریں گے۔ اس کے لیے ہمارے سامنے اسوۂ حسنہ موجود ہے۔ وہ تبدیلی تو اللہ کے رسول ﷺ کے ہاتھوں رونما ہوئی تھی اس لیے کم سے کم وقت میں آ گئی۔ ہمیں شاید زیادہ وقت درکار ہوگا لیکن سرفروشانِ اسلام کی ایک کم سے کم تعداد تیار کیے بغیر کوئی مثبت نتیجہ حاصل نہیں ہوسکتا۔ اس کے لیے حلقے اور شب بیداریاں شاید معاونت تو کریں لیکن کفالت نہیں کریں گی۔ اس کے لیے سکول، کالج، یونیورسٹی، مدرسہ اور مسجد پر بھرپور توجہ دینا ہوگی۔